نئی لائبریری

چند تصویرِ بتاں

افسانے

عصمت چغتائی

نیا ادارہ

چند تصویرِ بُتاں

رنگا رنگ نگارستان کا مجموعہ

چند تصویرِ بُتاں

افسانے

عصمت چغتائی

نیا ادارہ ۱۵۔ سرکلر روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار اول: ۱۹۶۶ء
ناشر: نذیر احمد چودھری
نیا ادارہ۔ لاہور
مطبع: سویرا آرٹ پریس لاہور

کرشن چندر کے نام — !

*

آنے والی نسلوں کے لئے
جس کے جلائے ہوئے چراغ
ہمیشہ روشن رہیں گے۔

عصمت چغتائی

ترتیب

لمبے ہاتھ	۹
سوکھے پتے	۲۰
مقدس فرض	۳۲
اندھا یگ	۵۰
اسرار الحق مجاز	۶۴
ساس	۹۵
چابڑے	۱۰۵
چند تصویر بُتاں	۱۱۶
چراغ روشن ہیں	۱۲۸
سارٹیفکیٹ	۱۵۶
کارساز	۱۶۷
پینی	۱۸۳
دوزخی کا بھوت	۱۹۸

لمبے ہاتھ

سب سے پہلے تو ان کا نام ہی موضوع بحث تھا۔ عام طور پر نورالدین قمرالدین علاؤالدین نام ہوتے ہیں۔ مگر کوئی ان سے اپنے ناموں کی مطابقت سے ان کے اعمال کی جانچ پڑتال نہیں کرتا۔ اور نہ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے نام کی اہلیت کو زندگی کے ہر شعبہ پر لاگو کر سکیں گے۔ نام نمود اعمال سے پھلتا پھولتا ہے اور اس افراتفری کے عالم میں نام پیدا کرنے کے لئے تگڑا نام باز ہونا ضروری ہے۔ جو نورالدین کے بس کی بات نہ تھی۔

نورالدین کمپنی کی گاڑی سنبھالتے تھے۔ کسی ڈائریکٹر یا شیئر ہولڈر کے نجی ڈرائیور نہیں تھے۔ وہ اس نکتے کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ اکثر کمپنی کے حکم سے گاڑی مختلف عہدیداروں کے استعمال کے لئے دے دی جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس عارضی صورتِ حال کو نہیں بھولتے اور عارضی مالکوں کو عارضی ہی سمجھتے۔

مہینے میں ایک دن مقررہ وقت کے لئے گاڑی انہیں ذاتی استعمال کے لئے بھی ملتی۔ تب وہ دن پورہ سے اپنے بر قع پوش خاندان کو لاد کر کسی درگاہ پر زیارت کے لئے لے جاتے

یا رانی باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ ان موقعوں پر انہوں نے کبھی پٹرول کی مقررہ مقدار سے زیادہ نہیں خرچ کیا۔ کیونکہ بڑے دیندار آدمی تھے بلکہ ان کی یہ صفات اکثر کوفت کا باعث بن جاتیں روزے نماز کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ لیکن نورالدین کی پابندی ذرا حد سے بڑھ جاتی۔ پکنک سے تھکے ہارے لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں ایک دم گاڑی روک لی۔ بغیر کچھ کہے سنے لپک کر جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے۔ کون منع کر سکتا ہے۔ حاجت رفع کرنے گئے ہوں گے۔ مگر نہ جانے کیوں انہیں رومال پر سجدہ کرتے پاکر کوفت سی ہونے لگتی۔ جیسے وہ اپنی دینداری کا رعب جھاڑ کر مالک کو عذاب دوزخ کی یاد دلا رہے ہوں۔ رمضان میں روزے سب ہی رکھتے ہیں۔ مگر نورالدین کے روزوں کا کوئی موسم مقرر تھا نہ جواز بس اندھا دھند روزے رکھتے تھے۔ کبھی مالک کا دریائے سخاوت جوش میں آجاتا اور پکنک کے دوران ایک پلیٹ انہیں بھی بخشنا چاہتے تو اطلاع ملتی کہ روزے سے ہیں۔ نہ جانے کیوں جی جل جاتا۔ پاجی صرف جی جلانے کو روزہ کا بہانا بناتا ہے رکھتا وکھتا خاک نہیں۔ رات کتنی ہی ڈیوٹی ہو جائے وہ کھانا کبھی نہیں کھاتے۔

"بھئی صاحب لوگ سب کچھ کھاتے ہیں، ہم تو نہیں کھا سکتے" وہ نوکروں سے کہتے خریداری کرتے وقت ان کی موٹر جنرل اسٹور کے سامنے رکواتے تکلف ہوتا اور سایچ۔ خریدتے وقت کچھ ہچکچاہٹ سی ہونے لگتی۔ کم بخت کہیں لکچر نہ جھاڑنے لگے۔ حالانکہ ایسا کبھی ہوا تو نہیں۔ کم بخت نہایت گھنا بنا بیٹھا رہتا کہ خواہ مخواہ احساس جرم سر اٹھانے لگتا۔

اتنا کٹر تھا مگر جب دیوالی دسہرے پر موٹروں کی پوجا ہوتی ہار، پھول، سیندور سے سجایا جاتا تو نورالدین بہت شکر گزار نظر آتے۔ جیسے پوجا پاٹھ سے بھی موٹر کی درازئ عمر کے امکانات ہیں۔

"تمہاری گاڑی کی شدھی ہو رہی ہے نورالدین تمہیں کوئی اعتراض نہیں"

"نہیں صاحب دعا وہ کسی دل سے بھی نکلے برکت ہی لاتی ہے۔" وہ بڑے وثوق سے کہتے۔ گنپتی، جنم اشٹمی عید میلاد کے موقع پر دل کھول کر چندہ دیتے اور باقاعدہ بھجن کیرتن سُن کر جھومتے سُر دھنتے عجب بونگے تھے۔

مالک کا خیال تھا نورالدین فراڈ ہیں اور صرف جی جلانے کو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔

نورالدین کی اَمپالا کیوں کہ وہ اُسے ہماری اِمپالا ہی کہا کرتے تھے بے حد حسین تھی اُسے وہ "حسینہ" بھی کبھی پیار سے کہہ لیتے تھے۔ اس پر بہت کم مرمت کا خرچہ آتا۔ چھوٹی موٹی خرابیوں کو تو وہ خود ہی دیکھ لیتے اور مرمت کراتے وقت میکینک کے سر پر سوار رہتے کہ کچھ ایسی ویسی نہ کردے۔ پتہ نہیں ان کی زبان میں کیا جادو تھا کہ اُن کی زبردستیاں بھی لوگ جھیل جاتے۔ اصل میں لوگ انہیں کچھ مُلّا یا پیر قسم کا پہنچا ہوا انسان سمجھتے تھے۔ جھاڑ پھونک میں یقین رکھنے والے اُن سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کی بھی فرمائش کرتے۔ ان کی دعاؤں کی دربارِ الٰہی میں آسانی سے شنوائی ہوتی تھی۔

"مسلمان ہو کر ان ڈھکوسلوں میں یقین رکھتے ہو؟" مالک انہیں چِت کرنے کے لئے پوچھتے۔

"یقین تو ان کا ہوتا ہے صاحب، ہم تو بس اللہ کے نام کا ورد کرتے ہیں۔ اللہ تو سب ہی پر رحم فرماتا ہے۔"

اور سب سے زیادہ جی جلانے والی اُن کی "ہم" تھی اور دوسری "صاحب"۔

"تم نے غور کیا ہوگا یہ پاجی کسی کو سرکار یا حضور نہیں کہتا بس صاحب کہتا ہے اور ہمیشہ "ہم" بولتا ہے جیسے یہ ایک فرد نہیں جم غفیر ہے۔ ضرور یہ نوکروں کو ورغلاتا ہوگا۔" صاحب اپنی میم صاحب کو آگاہ کرتے۔

"دیکھنے میں تو بھلا آدمی لگتا ہے۔" میم صاحب مسکرائیں۔ اور صاحب کا جی جل جاتا اصل

قابل اعتراض بات ان کی صورت شکل تھی۔ نہایت موزوں دراز قد گورے چٹے پٹھان تھے۔ رام پور، مراد آباد، الہ آباد کی طرف کے باسی، سنہری ڈاڑھی جس میں اب چاندی بھی چمکنے لگی تھی۔ ڈگ سنولا کر اور پکا ہو گیا تھا۔ بقول بے بی لوگ کافی ٹال ڈارک اینڈ ہینڈسم تھے۔ ایسے نیچے درجہ کے لوگ بے بی لوگوں کے حق میں بڑے زہریلے ثابت ہوتے ہیں۔

"نورالدین ایڈوڈڈ دی سیونتھ کی شکل کا لگتا ہے۔" بے بی چہکتی۔ حالانکہ بے بی کو بڑی شکایت تھی کہ نورالدین اسے بے بی کے بجائے بی بی کہتے تھے۔ بی بی، بالکل بھنڈی بازاری لگتا ہے چاند بی بی شنو بی بی سکینہ بی بی، گھن آتی تھی اُسے بیبیوں کے تصور سے نورالدین کو تنبیہہ کی جاتی تو کہتے۔

"ہمیں بے بی اچھا نہیں لگتا۔ بے بی لوگ تو فلم والیاں کہلاتی ہیں۔

مگر اس دن تو نورالدین نے غضب کر دیا۔ جس دن رات کو پارٹی میں سب مسز مشل کے ہاں جا رہے تھے۔ کاک ٹیل پارٹی ٹیرس پر تھی اور رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے ٹیرس جھما جھم کر رہی تھی۔ پہنچ تو گئے راستہ بتانے کے بعد، مگر ایک دم نورالدین نے گاڑی پھر اسٹارٹ کر دی بڑی مشکل سے ادھ کھلا دروازہ بند کیا ورنہ ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔

"آپ اس عورت کے ہاں جا رہے ہیں۔" انہوں نے گاڑی دھیمی کر کے کہا۔ "بابا لوگ آپ کا جی چاہے تو جائیے اس قتالہ کے ہاں مگر ہم بی بی کو یہاں نہیں اتاریں گے۔"

"کیوں؟" سب چلائے۔

"یہ بڑی مزاحمہ ہے۔ کالا دھندا ہوتا ہے۔ شریف بیٹیوں کا اس کے فلیٹ میں کیا کام، ہم تو آپ کو بھی رائے دیں گے کہ نہ جائیے۔"

"تم ہوتے کون ہو، اور تمہاری رائے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں، گاڑی موڑو۔

"نہیں گاڑی اس کے گیٹ پر نہیں رُکے گی۔ جائیے صاحب سے رپورٹ کرتے ہیں تو کر دیکھئے۔ انہیں پتہ نہیں کہ یہ کیسی عورت ہے واپس چلتے ہیں۔ اگر صاحب نے کہہ دیا تو پہنچا دیں گے۔"

خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ پاپا خود مسز شل کے مہربانوں میں سے تھے مگر یہ بذات فلسفہ چھانٹے گا تو منہ دیکھے کو انہیں بھی بچوں کو پھٹکارنا پڑے گا، کم بخت نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ طوفانی رفتار سے واپس لے آیا۔ اور سب بھیگی بلیوں کی طرح اُتر پڑے۔ اندر جا کر بہت بیل مچاتے مگر کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ نورالدین سے اُلجھتا۔ اس دن سے نورالدین کا وجود اور بھی خار کی طرح کھٹکنے لگا۔

"یہ باسٹرڈ ہوتا کون ہے ہمیں منع کرنے والا۔ پاپا اسے نکالئے۔"

"ہمارا ذاتی ڈرائیور نہیں، کمپنی کا ڈرائیور ہے، بورڈ کی میٹنگ کے بغیر اس کا پتہ نہیں کاٹا جا سکتا تھا۔ کمپنی کی اجازت سے ہم نے تمہارے لئے گاڑی لی تھی کیوں کہ شل کو بخار آ رہا ہے۔"

"مگر کمپنی میں آپ کی رائے کی کوئی شنوائی نہیں۔"

"ماتھر صاحب کا منہ چڑھا ہے وہ اس کی پچ کرتے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی بات ہاتھ بھی تو نہیں آتی۔ بہت سے لوگ اس سے نالاں ہیں۔ اس کی موٹر بڑی ٹپ ٹاپ رہتی ہے خود ہی اس کی لیپا پوتی کر لیتا ہے۔ دوسری موٹریں خراب ہو جاتی ہیں تو ماتھر اس کا حوالہ مانگتے ہیں کہ بھئی نورالدین ذرا دیکھ کر بتاؤ کیا مرمت ہونی ہے۔ اور یہ چھوٹی موٹی خرابی اسی دم دور کر دیتا ہے۔ دوسرے ڈرائیور جز بز ہوتے ہیں۔ مرمت میں مکینک جو بل بناتا ہے اس میں ڈرائیوروں کا بھی کمیشن ہوتا ہے مگر سب جھیل جاتے ہیں۔"

"آخر کیوں جھیل جاتے ہیں؟"

"یہ ہندوستانی بڑے وہمی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں بڑا سادھو سنت ہے ایسے کلمے اور منتر

جانتا ہے کہ ہزاروں میل پر بیٹھا چمن بھر میں دم توڑ دے۔ وہ گونگا ہوتی ہے کچھ وہ پھینکتا ہے آنکھوں میں ایسی شکتی ہے جسے گھور کر دیکھ لے وہ بندی ہو جائے۔"

"احمق ہیں یہ لوگ پورا ایڈیٹ ہے۔ اور ممّا بھی اس کی بڑی قائل ہیں۔ پتہ ہے پپا جب آپ کا آپریشن ہوا تھا تو ممّا نے درگاہ پر اس سے دُعا منگوائی تھی اور پیسے دیئے تھے نیاز کے لئے آپ سے چھُپ کر۔"

"مگر پلیز پاپا اُسے کسی طرح نکلوایئے کمپنی سے۔"

"بڑا کمینہ مائنڈیڈ ہے۔ تمام نوکروں پر رعب جھاڑتا ہے۔ سب کو ڈراتا ہوگا مگر ہے بڑا کائیاں۔ ایک دن میں نے بالکنی سے دیکھا اُکھیا بنا اسٹول پر بیٹھا تھا اور فارسی کے شعر سُنا رہا تھا۔ سب گدھوں کی طرح سر دھن رہے تھے۔ پھر بولا۔ کیا سمجھے!

سمجھے تو کچھ نہیں یہ بات ضرور بھاری کہی ہوگی۔ سمجھاؤ خان صاحب سب گھگیانے لگے تو بولا۔

ایک دن عمر خیام نے شراب کے نشے میں اُول فول کچھ بک دیا ہوگا۔ اور نشہ میں گلاس اُلٹ گیا تو عمر خیام ہنسا اور بولا، اے اللہ میاں میں نے بکواس کی، تو بُرا مان گیا اور میرا بھرا گلاس اُلٹ دیا۔ بس جی اللہ پاک کو یہ جواب پسند آگیا اور دریائے رحمت جوش میں آگیا۔ عمر خیام کا کالا منہ، پھر گورا چٹا ہوگیا۔ تو بھائیو اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔

تو پتہ ہے پاپا سب واہ واہ کرنے لگے۔ اور ڈینو گدھا بولا۔

"کھان ساب ہمیں بھی مسلمان بنا لیو۔"

"پھر!" سب نے ایک دم پوچھا۔

"ارے وہ تو اکڑنے لگا۔ بولا کیوں بے، ہمیں اُلّو بناتا ہے۔

"نہیں کمان ساب کسم ہے، مجھے مسلمان کرلو۔ ہم بھی تمہاری جنت میں مزے کریں گے۔
خان بھڑک اُٹھا۔
بے جنت کی خاطر مسلمان ہوگا تو اللہ میاں تیری چال سمجھ نہیں جائیں گے۔
جرور سمجھ جائیں گے اور سالے کو دوزخ میں جھونک دیں گے کریم نے لقمہ دیا۔
بے چارے دینو کا منہ اُتر گیا۔ تو خان بولا۔
اسے کیوں مرا جاتا ہے تو میرے اللہ سے بچ کر کہاں جائے گا۔ تو جہاں بھی ہو اس سے چھپ نہ پائے گا۔ تو جہاں بیٹھا ہے نا تیرے اوپر بھی اللہ ہے اور نیچے بھی اللہ۔
دینو اُچک کر کھڑا ہو گیا۔ خان خوب ہنسا۔
نائیں بھائی اللہ سے دور بھاگ کر کہاں جائے گا وہ تو ذرہ ذرہ میں موجود ہے۔
"تو نورالدین نے اُسے مسلمان کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑا چنٹ ہے کوئی پوچھے بڑے مسلمان بنتے ہو تبلیغ اسلام سے جی چراتے ہو، گمراہ کو راہ دکھانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔"
"میں نے پوچھا پاپا۔" سعید بولا۔ کہنے لگا صاحب ہم تو خود ہی ابھی راستہ ڈھونڈ رہے ہیں، ہم کسی کو کیا راہ دکھائیں گے۔ راہ دکھانے والا تو اللہ پاک ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی نہیں بھولتا پھر نہ جانے وہ کیا عربی میں بڑبڑانے لگا۔"
"آدمی پڑھا لکھا ہے۔" میم صاحب بولیں۔
"عربی فارسی کس کام آتی ہے جی۔ پہلے کہیں ماسٹر تھا، پچھتر روپے ملتے تھے۔ یہاں سارے چھ سو مارتا ہے۔ اُوپر سے الاؤنس وغیرہ بڑا لالچی ہے۔
میں جب بھی جاتی تھی نورالدین کی شکائتیں سننے میں آتیں۔ عجیب عجیب شکائتیں مثلاً لانڈری میں وردی دھلواتا ہے۔ ویسے تو سب کو ہی کمپنی لانڈری کا خرچ دیتی ہے مگر وہی سب

کچھ گول مال کرتے ہیں۔ جھوٹی رسیدیں داخل کر دیتے ہیں۔ میلی وردی پر ڈانٹ پڑتی ہے تو نورالدین کی وردی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ سب اس کم بخت سے نالاں ہیں۔ مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکا۔

خیر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

یہ بمبئی ہے۔ یہاں کیا نہیں ملتا۔ بس بھینس کے انڈے اور چڑیا کا دودھ شاید نہیں ملتا۔ لیکن اگر سچی لگن ہو تو اس کا بھی توڑا نہیں۔

ادھر چند مہینے بمبئی سے باہر گزرے بے بی کی منگنی کی رسم میں جانا ہوا تو پتہ چلا نورالدین کمپنی سے نکال دیئے گئے۔ تفصیل پوچھنے کا موقع تھا نہ کوئی دلچسپی لے رہا تھا۔ نورالدین کے نام پر سب خاموش ہو گئے۔ میم صاحب کوئی چیز ٹٹولنے میں ڈھونڈنے میں ایسی کھوئیں کہ میرا سوال سنا بھی نہیں۔ بے بی کے بھاری جھمکے کان دکھانے لگے۔ وینو جو نہایت اجلی وردی پہنے ہیڈ بیلر بنا رعب جھاڑتا پھر رہا تھا۔ کچھ چور سا لگنے لگا۔ اور وہسکی کی نئی بوتل کھولنے میں بے طرح مشغول تھا۔ میرے بار بار مختلف لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ نورالدین بڑی گہری رقم نکلے، ان کے گھر سے اسمگلنگ کا سامان آخر پکڑا ہی لیا گیا۔ تیس گھڑیاں دو ٹیپ ریکارڈر اور کئی درجن نائیلان کی ساڑیاں پکڑی گئیں۔ بیوی نے کہا ایک آدمی تالا لگا سوٹ کیس دے گیا کہ نورالدین نے بھیجا ہے۔ بیوی نے رکھ لیا کوئی دو گھنٹے بعد پولیس کی دھاڑ پڑی۔ بیوی کے چھکے چھوٹ گئے۔ بچے ماتم کرنے لگے۔ محلے میں کہرام مچ گیا۔ نورالدین کو گرفتار کر کے گھر لایا گیا انہوں نے صورتِ حال دیکھ کر فوراً اقبال کر لیا کہ بیوی بے گناہ ہیں۔ محلہ والے بھی پڑے اس لئے پولیس نے بیوی سے کوئی باز پرس نہ کی۔ بیوی سے خدا حافظ کہنے لگے تو وہ بکھر گئیں۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"چپ رہو" انہوں نے ڈانٹ بتائی۔

"اچھا بڈو کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیے"

"ہم کہتے ہیں چپ رہو" وہ گرجے۔

باہر نکلے تلاشی دینے سے پہلے انہوں نے جیب سے رامپوری چاقو نکالا۔ اور ایک کھٹکے سے اس کا پھل باہر اُچھل گیا۔ یہ وہی چاقو تھا جسے دیکھ کر مالک نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ چاقو نہ رکھا کریں۔ انہوں نے جواب دیا تھا یہ چاقو ان کا خاندانی ورثہ ہے اس چاقو سے ان کا نال کاٹا گیا تھا۔ وہ نوکری چھوڑ سکتے ہیں چاقو سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ کچھ دیر وہ چاقو کے چمکتے پھل کو دیکھتے رہے پھر جیسے اس کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ انہوں نے چاقو بند کیا اور پولیس کو تھما دیا۔ اب اُن کے جسم میں دو حساس آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے سوا کوئی خطرناک ہتھیار نہ رہا تھا۔

یہ سُن کر مجھے ذرا تسلی ہوئی کہ انہیں کسی فتنہ پرداز کی شرارت کا شکار مان کر پولیس نے رہا کر دیا۔ ماسٹر جی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انہیں بچا لیا مگر بورڈ کی میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ انہیں دوبارہ وردی دینا حماقت ہوگی۔ اور اس طرح وہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایک دن میں فلورا فاؤنٹین پر چھوٹے چھوٹے اسٹالوں پر اسمگل کی ہوئی چیزیں دیکھتی پھر رہی تھی کہ لیفٹ چینز کا ایک ڈبہ بائیس روپے میں آشیش کے لئے خریدا بہت دن سے ضد کر رہا تھا۔ سوچا برسات آرہی ہے ایک ربڑ کی چپل بھی خرید لوں۔ چپل پسند کر کے قیمت پوچھنے کے لئے نظریں اُٹھائیں تو بھونچکی رہ گئی۔ ہاتھ کا دھلا پاجامہ۔ ملگجی سی قمیض پہنے نورالدین ربڑ کی چپلیں بیچ رہے تھے۔ بالوں میں سفیدی بڑھ گئی تھی۔ سر پر کشتی رامپوری ٹوپی کافی پرانی ہو گئی معلوم ہوتا تھا ایک دم بڑھاپے کے بھوت نے آن دبوچا ہے۔ آنکھوں میں عجیب

سی دوری اور بیگانگی تھی، جیسے کسی سایہ کو تلاش کر رہی ہوں۔

"کیسے ہو نورالدین؟" میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ کہیں ولایت گئی تھیں؟"

"نہیں نہیں ملک کے دوسرے کونے میں گئی تھی۔"

"ہماری اسپالا تو مزے میں ہے۔ وہ مردود رگھو بڑا ہی کوڑھ مغز ہے۔ گاڑی گدھا سمجھ کے ہانکتا ہے۔" وہ بڑی خوش مزاجی سے بولے۔ مگر آواز رندھ گئی۔

"نورالدین، جھوٹا الزام تھا؟"

"الزام کے معنی ہیں، جھوٹا۔ جرم تو سچ ثابت ہونے کے بعد میں بنتا ہے۔"

"تو مدافعت کیوں نہ کی؟"

"مہاشیر سے پالا پڑ گیا۔ ویسے دیکھنے میں بعض لوگ پستہ قد ہوتے ہیں مگر ہاتھ ان کے لمبے ہوتے ہیں اور ان لمبے ہاتھوں سے آگے ہماری پہنچ۔" شکر ہے اُن کی "ہم" ابھی زندہ تھی۔ ایک دم سے فٹ پاتھ پر کھلبلی مچ گئی۔ پھٹ پھٹ اسٹال بند ہونے لگے۔ کچھ اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ میں سمجھ گئی۔ پولیس آ رہی ہو گی اُس کی خبر آئی ہے۔ لوگ برتن بھانڈے سمیٹ رہے ہیں۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں، اپنی ہے پولیس ہفتہ دیتے ہیں سب انہوں نے جلدی جلدی ایک کپڑے کے بیگ میں سامان سمیٹنا شروع کیا۔ یہ سامنے جوتوں کی دکان کا مال ہے، فٹ پاتھ پر ٹیکس نہیں لگتا، تھوڑا کمیشن جاتا ہے۔"

ذرا سی دیر میں سارا سامان دکانوں میں پہنچا گیا۔ ڈبے تختے گلی میں کھڑے کر دیئے گئے۔

"آپ کے بٹوے میں جو مال ہے وہ . . . . بہتر ہے آپ چلی جائیے۔ یہ پولیس والے

دکھاوے کو کچھ نہ کچھ تو پکڑتے ہی ہیں۔ بیکار کی زحمت ہوگی" نورالدین نے رائے دی۔ بٹوے میں کرلیفٹ چینز کا ڈبہ تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے وقت میں نے دیکھا نورالدین فٹ پاتھ پر دیوار سے لگے اکڑوں بیٹھے اپنے آبائی رامپوری چاقو سے ناخن تراش رہے تھے۔

خدائے قہار و جبار نے آج ہر موسیٰ کے حامی کو لمبے ہاتھوں والے فرعون لگا دیئے ہیں۔ خدا ہی جانے یہ لاٹھی کب اژدہا بنے گی۔ تب سمندر بیچوں بیچ سے شق ہو جائے گا۔ اور جینے کے راستے پھیل جائیں گے۔

"کسی مسجد سے اذان کی آواز ٹریفک کی گھن گرج میں سہمی سہمی بھٹک رہی ہے۔ لوگ لپک جھپک ببول کراسنگ پر دھکا پیل میں جٹے ایروز سینما پر یلغار کر رہے ہیں۔ سات روپے کا ٹکٹ پندرہ روپے میں۔ نورالدین نے تیس روپے جیب میں ڈالے اور مجھے دو ٹکٹ پکڑا دیئے۔ سینما ہاؤس کی پیشانی پر چپکے ہوئے پوسٹر میں "سپرمین" ہاتھ پھیلائے اسٹیچو آف لبرٹی کے اوپر محو پرواز ہے!

سوکھے پتّے

گھنٹی بجی، نوکر سودا لینے گیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک میلا کچیلا بدبودار انسان دو سیڑھیاں چڑھ کر ٹھٹھک گیا مجھے دیکھ کر بُری طرح خوفزدہ ہو گیا۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ منہ کھلا مگر آواز نہ نکلی جیسے اس نے ایک دم کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"آیئے اوپر آ جایئے" میں نے کہا۔

اس کی پیشانی پر پسینہ چھوٹ نکلا۔ بغل میں دبی ہوئی فائل لرزتے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی۔ منہ، سانس لینے کے لئے کھولا۔ لب پھڑپھڑائے۔ فائل اُٹھانے کو جھکا۔ تو ہاتھ سے دو لوہے کے گولے چھوٹ کر سیڑھیوں سے لڑھک گئے۔ اس نے پھر زخمی کبوتر کی طرح مجھے سہم کر دیکھا۔ جلدی سے فائل سمیٹی، کاغذ اُلٹے سیدھے ٹھونسے اور گولے سمیٹنے لگا۔ ایک سسکی سی اس کے منہ سے نکلی اور وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ کر سرپٹ بھاگا۔

"نہ جانے کون مسخرا ہے" میں بالکنی سے اسے پھاٹک کی طرف لپکتا دیکھتی رہی۔ کچھ بھورے بھورے سے کپڑے، سرخی کی جھلک لئے لمبے گندے بال، بڑے بڑے ڈھیلے بے موزوں ربڑ کے جوتے، خپ خپ دھول میں اٹی پھٹی ایڑیاں، دور تک دکھائی دیتی رہیں۔ پھر وہ دفتری روڈ پر لپک گیا۔

شاہد اسٹوڈیو سے لوٹے تو ان کے ساتھ منٹو بھی تھے۔ میں نے اجنبی کا حلیہ بتایا تو ذرا منٹو بولے۔

"ارے میرا جی ہوگا۔"

"ارے ہاں، آج اتوار ہے نا، میں نے اُن سے ملنے کا وعدہ کیا تھا، کم بخت مکرجی نے آج شوٹنگ رکھ دی۔ کیا کہتے تھے!"

"اچھا، تو کچھ کہتے بھی ہیں! وہ تو مجھے دیکھ کر ایسے رپٹے، کہ جیسے میں انہیں ڈکار ہی جاؤں گی۔"

"تمہارے اکھڑپن سے گھبرا گیا ہوگا۔"

"لو بھلا، اتنے چرخ چوہے پر میں کیا اکھڑپن کا رعب جماتی۔ مجھے تو بے چارے پر بڑا ترس آیا۔"

"یار، بے چارے پر ترس تو مجھے بھی آتا ہے، بڑی بُری حالت ہے۔ مکرجی سے کہا تو ہے کہ اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ میں رکھ لو۔ بڑا اچھا ادیب ہے۔ شاعر بھی ہے۔

"بکواس!" منٹو جھلایا۔ "بس سالی میرا سین کا دونا روتا ہے۔"

"میلا بہت رہتا ہے" میں نے بے چارگی سے کہا "نہ جانے کیوں بچپن میں مجھے ہمیشہ

سڑک پر گھومتے میلے کچیلے یتیم بچوں کو نل کے نیچے تیرنے پر مار پڑتی تھی۔

میراجی چاہا کہ ایک بڑے سے ٹب میں میراجی کو بیل باتھ دوں۔ بال صفا چٹ نہیں بال تو اس کے بڑے گھنے ہیں اور دھل کر کافی اچھے لگنے لگیں گے، ذرا سے چھانٹ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اونچے نیچے ہیں بڑھا ہوا شیو نائی کو بلوا کر بنوایا جا سکتا ہے اور اگر وہ نچلا بیٹھنے کو تیار ہو تو شاہد کے سیفٹی ریزر سے شیو بھی بن سکتا ہے۔

آج نہ میراجی ہیں، نہ منٹو اور نہ شاہد لطیف۔ مگر کچھ تصویریں ہیں، جو دماغ کے البم میں چپکی رہ گئی ہیں۔ مجھے میراجی کی شاعری کچھ زیادہ پسند نہ تھی۔ اصل میں ہمارے خاندان میں شاعری کو ہیجڑوں کا فن کہا جاتا تھا۔ پھر میں نے جب شاعری میں دل چسپی لینی شروع کی، تو اپنے بزرگوں کی جہالت پر بڑا افسوس ہوا۔ مجاز میرا پہلا شاعر تھا جسے میں نے سمجھا اور پسند کیا تھا۔ اور پھر جگر صاحب اور جوش صاحب پر دل آگیا۔ اپنے خاندان میں شاید میں ہی پہلی فرد تھی جس نے شاعری میں اچانک غیر معمولی دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔ مگر میراجی تو میرے پلے ہی نہ پڑتے تھے۔ ان کی شاعری نہایت روہانسی اور کچومر گھلی سی لگتی تھی۔ یہ میری جہالت ہی ہو گی۔ کیونکہ نئے شاعر تو انہیں پیر و مرشد مانتے ہیں۔

میراجی سے میری دوسری ملاقات ایک فلمی دعوت میں ہوئی۔ وہ بھیڑ میں کچھ اکیلے سے بھٹک رہے تھے۔ میں نے اب تک ان کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ کسی سے بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ بڑے انہماک سے پی رہے تھے اور جلدی جلدی گلاس تازہ کر رہے تھے۔

پھر میں نے دیکھا وہ ایک صوفے کے کونے پر ٹکے تنہا بیٹھے تھے۔ میں ایک دم سے جا کر

اُن کے قریب بیٹھ گئی وہ ایسے اچھلے جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا۔ مگر میں نے کہا۔

"بھاگنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ورنہ ہاتھ پکڑ لوں گی اور آپ چھڑا نہیں پائیں گے۔"

وہ چپ چاپ زمین کو گھورنے لگے۔

"اور سب کہیں گے بدنام زمانہ ادیبہ نے بھری سبھا میں میراجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بڑا مذاق اُڑے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر آپ بدنام ہو جائیں گے۔" وہ کچھ نہیں بولے۔

جی چاہا پوچھوں "کس صدی میں غسل میت فرمایا تھا؟" مگر مجھے یقین تھا کہ وہ زخمی کبوتر کی طرح تھرتھرا کر رہ جائیں گے۔ منہ توڑ جواب ہرگز نہ دیں گے۔ وہ بڑے معصوم، دُکھی اور غم کے مارے انسان ہیں۔ سہتے پر وار کرنا بزدلی ہے۔ انہیں یوں بیٹھنے پر مجبور کرنا بھی میری طبعی سادگی کا ثبوت ہے۔

وہ بڑی تیزی سے مٹھی میں جکڑے ہوئے لوہے کے گولے مسل رہے تھے۔ یقیناً تخیل میں وہ مجھے پیس رہے تھے اور میں مُشت میں اُن سے کئی گنا زیادہ صحیح و سالم ذرا سی دھمکی کے سہارے اُنہیں قید کئے بیٹھی تھی۔

وہ دور نہ جانے کہاں دیکھ رہے تھے، میں انہیں سر سے پیر تک ناپ تول رہی تھی۔ نہایت مُسبک نقشہ حساس نازک ہونٹ جو بار بار تر ہونے کے باوجود خشک تھے نازک بدن، نرم نرم آنکھیں، جن میں اَن جانے کرب کا زہر، کرب جو نئی پود کو وہ ورثہ میں سونپ گئے۔

"یقیناً انہیں ماں کا دودھ نہیں ملا" میں نے سوچا، اور ان کے والد بے حد جھلے مزاج

کے ہوں گے۔ یہ شخص بازی گر نہیں ہو سکتا۔ یہ ڈھونگ نہیں۔ کبھی کسی نے انہیں لوری دے کر تھپک تھپک کر چھاتی پر نہیں سلایا۔ ان کے اشعار سپنولیوں کی طرح ان کے ردیّں رویّں میں اُلجھے ہوئے تھے، رینگ رہے تھے۔ میراجی مجسم اپنی شاعری لگ رہے تھے۔ میری محلّد دعقل کے پیالے سے!

پھر مجھے بل باتھ کی یاد ستانے لگی۔

کیا کبھی ماں نے گھٹنوں پر لٹا کے تیل کی نرم گرم مالش کی ہو گی؟ ننھے ننھے ہاتھ پیر بیسن مل کر دھلائے ہوں گے۔ ان ہونٹوں پہ دودھ کی دھاریں بہتیں تو پھر یہ خشک کیوں ہو جاتے ہیں بار بار۔

کیا میراسین نے ان لبوں کو کبھی خوابوں میں بھی نہیں چوما۔ پھر کیوں سوکھے پتوں کی طرح لرزاں ہیں۔

یا ایک ہی بوسے میں رس چوس لیا اور پھوک تھوک دیا۔

کتنے سوالات میرے دماغ میں طوفان مچا رہے تھے۔ مگر میں چپ تھی، کہ کہیں یہ ہوا پتاور ہے سے مشابہہ پرچھائیں جس پر زندہ انسان ہونے کا الزام ہے، دیئے کی لَو کی طرح پست نہ ہو جائے اور اپنے پیچھے فرش پر سوکھے پتوں کا ڈھیر چھوڑ جائے۔ پھر تو لوگ مجھے میڈوسا کا خطاب دے دیں گے۔ وہ بلا جس کے سر پر بالوں کی جگہ سانپ پھنکارتے تھے اور جس پر نظر ڈالتے ہی انسان پتھر بن جاتا ہے۔

ویسے بھی لاہور کے مقدمے کو زیادہ دن نہیں بیتے تھے۔ لوگ میری طرف ایسے دیکھتے

سے تے، جیسے ان کے اور میرے درمیان جیل کی آہنی سلاخیں ہیں جو غیر مرئی ہوتے ہوئے بھی ٹھوس ہیں۔

"آپ کچھ کھاتے نہیں، بس یکساں پیے جا رہے ہیں۔" میں نے سوچا، جو ہو گا دیکھا جائے گا، حملہ کر ہی دیا۔

وہ ایسے کسمسائے جیسے میں نے اٹھا کر انہیں جلتے توے پر بٹھا دیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوتے، میں نے کہا۔

"میرا جی آپ کو ہاتھ دکھانا آتا ہے۔ میں نے سنا ہے آپ کو علم نجوم سے بڑی دلچسپی ہے۔" میں نے اس قسم کی کوئی بات اُن کے بارے میں نہیں سنی تھی۔ میں نے ان کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا اور نادانستہ طور پر انہوں نے میری ہتھیلی پر نظر ڈال ہی دی۔

میرے دم میں دم آیا کہ شے میں جان ہے۔ زندگی کی رمق ہے۔

"کچھ زیادہ نہیں۔" وہ بولے اور مجھے ایسا لگا، میں نے گنگا نہالی۔ وہ بول دیتے!

"نجومی نے کہا تھا میرے ہاتھ میں ولایت کا سفر ہے۔" اور جواب سننے سے پہلے ہی میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر بولی "آپ کی لائف لائن تو بہت لمبی ہے۔ قیامت کے بور ہے بیٹھیں گے۔"

"کون سی ہے لائف لائن؟" وہ واقعی شیشے میں اُتر آئے۔ جب میں بی ایڈ کے لئے بچوں کی کلاس لیا کرتی تھی تو بچوں کو ہینڈل کرنے کے خانے میں سب سے زیادہ نمبر ملا کرتے تھے۔

"یہ..... یا شاید..... یہ..... میں نے ہوائی چھوڑی۔" بہت دن ہو گئے۔ کیرو کی کتاب دیکھی تھی۔"

"کھولی بھی تھی ؟"

ارے یہ تو ڈنگ مارتا ہے !

"ایمان سے پڑھی تھی۔ ٹھیک سے لائنیں یاد نہیں رہیں، مگر میں ہمیشہ سے صاف سیدھی اور لمبی لائن کو ہی لائف لائن سمجھتی ہوں۔ یہ دیکھئے میرے ہاتھ میں، یہ والی لکیر سب سے تگڑی ہے مگر آپ کے ہاتھ میں یہ دوسری والی بہت صاف اور سیدھی ہے۔ آپ بہت جئیں گے۔ مجھے جینے کا خبط ہے۔"

تب وہ سوکھے ہوئے حساس ہونٹ یوں ہی ذرا سا ہلے۔ شاید وہ اس سے زیادہ بڑا ڈگ نہیں بھر سکتے تھے اور وہ اکلوتی مسکراہٹ ہوگی جس کے درشن میرے نصیب میں لکھے تھے

"یہ لمبے کے گوٹے آپ کیوں مسلتے رہتے ہیں ؟ میں نے چہرے پر نہایت احمقانہ تاثر طاری کر کے کہا۔ بیوقوف عورتیں مردوں کو زیادہ دلچسپ لگتی ہیں۔ معصوم اور بھولی۔ اگر مردانگی کو جلا بخشنی ہو، تو ہوشیار اور عقل مند خواتین کو چاہیئے کہ احمق بن کر نہایت بچگانہ سوال کریں۔ کیسا بھی مرگھلا۔ گیا گزرا مرد ہو، فوراً سینہ سپر ہو جائے گا۔ اور وقتِ ضرورت آگ میں کود پڑے گا۔

مگر ذہنی طور پر میراجی مرگھلے قطعی نہ تھے۔ وہ پھر دور خلاء میں گھورنے لگے۔ ان کا گلاس بھی خالی ہو رہا تھا اور انجام کے خوف سے روح فنا ہو رہی تھی۔ میں نے فوراً ایک گزرتے ہوئے بیرے کو بلایا۔ دو گلاس اٹھائے اور سوڈے کی بوتل میز پر رکھوا لی۔

میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ آج تو نہیں کہ میں جتیں۔ میں نے دو گلاسوں کا ایک بنایا اور اس میں سوڈا انڈیل دیا۔ یہ لیٹ گیا تو میری بلا سے۔ مجھے تھوڑی تھوڑا پڑے گا " میں نے سوچا۔

"یہ گولے!" انہوں نے مٹھی کھول کر میرے سامنے کی۔ اور دوسرے ہاتھ سے گلاس دبوچ لیا۔

"جی" میں نے رشوت کا پھل سمیٹنے کے انداز میں لقمہ دیا۔

"یہ لوہے کے ہیں۔"

"جی ہاں وہ تو ہیں ہی" میں بجھ گئی۔ غنیم غچہ دے گیا۔!

"جب میری مٹھی میں ہوتے ہیں۔"

"جی!" بڑی فرمانبردار مشرقی خاتون کے لہجہ میں کہا۔

"جب میری مٹھی میں ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے دونوں جہان میرے قبضہ میں ہیں۔"

"دکھائیے۔ ذرا دیکھوں کتنے بھاری ہیں۔"

"ان کا بوجھ خدا آپ پر نہ ڈالے۔ آپ کے ہاتھ بہت نازک ہیں!" حالانکہ میرے ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چادل بھر لمبے ہی ہوں گے۔ مگر میں سمجھ گئی کہ ان کا اشارہ ہاتھوں کی طرف نہیں، میری قوت برداشت کی طرف ہے۔

"میں تو یہ گولے دنیا کی کھوپڑی پر پٹخ دیتی۔"

"یقیناً مجھے یہی یقین ہے۔"

ہم سب سے الگ بیٹھے تھے۔ ایک دم میں نے محسوس کیا بہت سی آنکھیں عجوبہ سمجھ رہی ہیں جیسے سانپ اور نیولے کی لڑائی ہو رہی ہو۔

ایک دم شیام لمبے لمبے ڈگ بھرتا پکا اور آتے ہی کسی قطعی بے بنیاد بات پر لڑنے لگا۔ اسکرین پر شیام رومانٹک سین بے حد مرے مرے کرتا تھا لیکن دھڑام دھڑام میں اس کا جواب

نہیں تھا۔

"اُدھر جوش صاحب اپنا کلام سنانے جا رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ حد ہے بدذاقی کی۔"

"بھئی جوش صاحب کا کلام سمجھنے کے لئے ہر تیسرے لفظ پر ڈکشنری دیکھنی پڑتی ہے۔ میں...."

"اچھا بکواس نہ کرو۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے کی دھمکی دی۔ مگر میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ مڑ کر دیکھا، میرا جی پھر! دور دور نام و نشان نہ تھا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا کوئی سوراخ نہ تھا۔ در و دیوار بھی سلامت تھے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

دیئے کی لَو پست ہو گئی اور صوفے پر سوکھے پتوں کا ڈھیر بھی نہ چھوڑا۔

"میں کہتا ہوں کرشن کا "ان داتا" ماسٹر پیس ہے...."

"بکواس!" منٹو نے منہ میں کونین گھول کر کہا۔

میرا جی سے پھر میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کئی برس گذر گئے۔ جب ہم شیواجی پارک میں رہتے تھے تو ایک دن ایک خط ملا۔ میں بڑی پھوہڑ ہوں۔ اُف! میں نے کیسے کیسے خط نہ جانے کہاں کھوئے۔ میں نے نہیں کھوئے میرے ایک بدذات نوکر نے میرے کاغذوں کا صندوق صاف کیا اور سب ردی میں بیچ دیئے ان دنوں ہسپتال میں تھی۔ اس صندوق میں اس نے شاید کے کپڑے، جوتے، میری ساڑھیاں اور چپلیں، فلموں کے ریکارڈ مع ریکارڈ پلیر اور ٹینیل نمبر ۵ کی لبالب بھری بوتل اور نہ جانے کیا کیا بھرا اور غائب ہو گیا۔ خدا اس سے سمجھے۔

اس ردی میں ایک مجاز کا رانچی سینی ٹوریم سے آیا ہوا تاریخی خط تھا جس میں انہوں نے

لکھا تھا کہ " خدا کا واسطہ مجھ سے شادی کر لو۔ ورنہ مجھے کچھ ہو گیا تو خون تمہاری گردن پہ ہوگا۔"

میں نے بے حد غصہ سے جواب دیا تھا " تمہاری ایسی کی تیسی۔ میں کوئی کیلشیم کا انجکشن یا ڈامسن کی گولی ہوں۔ شوق سے مر جاؤ۔ چھوٹے منہ سے اتنا لکھ دیتے: تم سے پیار ہے: تو ..... خیر!

اور ایک خط میراجی کا تھا۔ جس میں انہوں نے بڑی لجاجت سے لکھا تھا، کہ " خدا کا واسطہ میری شادی کروا دیجیے۔ بھنگن ہو، چماری ہو۔ بس عورت ہو۔"

خط پڑھ کر میں نے سوچا، خیر اتنا تو میں بھی جانتی ہوں: کہ میراجی کی شادی عورت ہی سے کرا سکتی ہوں۔ کسی پہلوان یا مخنث سے تو نہیں کرا سکتی، اتنی عقل تو مجھے بھی اللہ نے دے دی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ بمبئی میں بھنگنیں ہی نہیں ہوتیں یہ رومانٹک جنس تو یو پی اور پنجاب میں ہی پائی جاتی ہے۔ رہی چماری تو آس پاس کوئی چمرواڑی نہیں دکھائی دیتی۔ بڑا پوش ایریا ہے۔ زیادہ تر فلمی ایکسٹراؤں سے پالا پڑتا ہے اور وہ شادی کے نام سے ہی بدکتی ہیں۔ نہ میں نے جواب دیا نہ ان کا ریمائنڈر آیا۔ میراجی کے پھر درشن نہ ہو پائے۔ شاید وہ پونا سے چلے گئے۔ بمبئی کی زندگی اتنی سرپٹ دوڑتی ہے کہ ہوش نہیں رہتا۔

کبھی میٹنگ میں میراجی کی شاعری پر جلے بازی ہوتی میں کبھی اس مباحثے میں ڈوب کر حصہ نہ لے سکتی۔ اول تو شاعری کی گہرائیاں میرے پلے نہیں پڑتیں۔ بس جی کو چھوتی ہے تو اچھی لگتی ہے۔ دوسرے ان دنوں ترقی پسندگی تلوار ہو رہے تھے۔ بے حد زور شور سے انقلاب لایا جا رہا تھا۔ کوئی ذرا بھی ادھر سے ادھر کھسکتا نظر آتا، اس کے فوراً چھلکے کے لئے جاتے ہیں۔

میں جو زندگی کو عموماً ایک دل چسپ ہنگامہ سمجھنے کی عادی تھی ہر جارحانہ قدم بے حد اہم اور چٹپٹا نظر آتا تھا، زیادہ سنجیدگی سے نہیں، پھر بھی کافی جوش و خروش سے ہر الٹے سیدھے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں پیش پیش رہنے کی عادی تھی۔

غلطی کرنے سے خوف کھانا مجھے کبھی نہ آیا۔ ارے بھئی، غلطی ہو گئی تو کون سا اندھیر ہو گیا۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔

میرا جی کو نظر انداز کیا گیا، بلکہ غیر ترقی پسند بھی سمجھا۔ تو پھر؟ سمجھنے والے کی عقل پر شبہہ ہو تو ہوا کرے۔ اس وقت ہمیں یہ تھوڑے معلوم تھا کہ ایک دن جدید شعراء اور تنقید نگار انہیں امام کا رتبہ دے دیں گے۔ وقت وقت کی بات ہے اور پسند ناپسند پر کسی کا اجارہ نہیں۔ مگر جتنا انہیں پرستش کا حق ہے، اُتنا ہی نہ یقین رکھنے والوں کو نظر انداز کرنے کا حق ہے۔ یہ بھی کوئی احکام الٰہی ہے کہ مانا ہی جائے۔ ورنہ بخشش کھٹائی میں پڑ جائے گی۔

مجھے تو ن۔ م۔ راشد بھی بور لگتے تھے۔ ظاہر ہے بدمذاق اور کج فہم ہوں۔ اب خدا نے محدود سمجھ بوجھ دی تو رسماً اور اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے میرا جی اور ن۔ م۔ راشد کو پیر و مرشد مان لوں، کہ نہ مانا تو ناک کٹ جائے گی۔

کان پکڑ کر کہتی ہوں کہ میرا جی کی شاعری، میں اتنی یاسیت، بے چارگی اور ماتم ہے کہ میرا دم بولانے لگتا ہے۔ تاریکی، تنہائی، یاسیت، مجبوری، مرگھلاپن! اُف میرا تو دم بولاتا ہے اور پھر اپنج پینچ، گھومتے ہوئے معنی، حد سے زیادہ "پتہ کی بات" جو سمجھنے میں کوفت پہنچائے نہیں بھئی وہ کتنی بھی بلند پایہ اور مقدس ہو، نہیں چلے گی۔

مانا کہ میرا جی کو ماں کا دودھ نہیں ملا۔ کانوں میں کومل لوریاں نہیں گھلی ہوں گی۔ لڑکیاں بے وفائی کر گئیں۔ اس میں بے چاری لڑکیوں کا کیا دوش۔ پیدا ہوتے ہی نانیاں دادیاں کہہ دیتی ہیں۔ "بیٹی مضبوط کھونٹا دیکھ کے گلے میں پھندا ڈالنا"۔ ظاہر ہے مضبوط کھونٹے مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے بڑے بڑے دل ٹوٹتے ہیں، تنہائیاں ڈستی ہیں۔ اندھیرے گھونٹتے ہیں، وجود بکھرتے ہیں، انسان ٹوٹتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب طوفان سے ٹکرانے والے نوجوان سینہ سپر تھے، وہ بھی بے روزگاری مفلسی، تنہائی، لاچاری اور مجبوری کا شکار تھے۔ مگر سرنگوں لٹو سے نہیں بہار ہے تھے۔ پہاڑوں سے ٹکرا رہے تھے۔ بہاتمگ دُہل مجرموں کو للکار رہے تھے اور لڑکیاں ان پر نثار ہوا کرتی تھیں۔ میرا جی جیسوں کو میرا سین ملی جوان کا ملغوبہ بنا کر چلتی بنی کہتے ہیں انہوں نے اس کے نام پر ہی میرا جی اپنا تخلص رکھ ڈالا۔ انتہا ہے بیچار پن کی۔ کوئی بھی سمجھ دار لڑکی کسی اتنے پھُس پھُسے مرد سے وابستہ ہونا پسند نہ کرے گی جو اس کی بیگم کا مقام پاکر فخر کرتا ہو۔ ملک پر موت اور زندگی کا ہیجان طاری ہو اور ایک لڑکی کے عشق میں سر پیٹ رہا ہو۔ آج جب کہ ساری دنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے، ملک میں گھمسان برپا ہے۔ میرا جی "ابابیلیں اُڑا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں جب بھی "میرا جی" کو پڑھتی ہوں، مجھے قبرستان میں سوکھے ہوتے پتوں کے ڈھیر یاد آجاتے ہیں، جن پر اوس کی نمی سے کائی جم گئی ہے اور دھیمی دھیمی سڑاند اُٹھ رہی ہے۔ یہ سوکھے پتے آہستہ آہستہ کھاد بن جائیں گے

مقدس فرض

صدیقی صاحب کے ہاتھ سے وہ چھوٹا سا پرزہ نیم جان پروانے کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا ان کی گود میں گر پڑا۔ انہوں نے جلدی سے اسے دامن سے جھاڑ دیا۔ جیسے اس کے زہریلے ڈنگ ان کے وجود میں پیوست ہو رہے ہوں۔

باہر بیگم شامیانے میں قندیلیں اور رنگ برنگے فانوس آویزاں کروا رہی تھیں۔ قالینوں کے ڈھیر پر بیٹھی وہ مبارک باد کے تار اور خط بھی پڑھتی جا رہی تھیں جو دور دراز کے ملکوں اور اندرون ملک اور دہلی سے انہیں شادی میں شرکت کے بارے میں تھے۔ ایک دن بعد شادی تھی ان کی لاڈلی ثمینہ۔ جس نے اسی سال بی ایس سی کا امتحان اوّل نمبروں سے پاس کیا تھا۔

لڑکا دوبئی میں بارہ ہزار مہینہ فری بورڈ اینڈ لوجنگ سال میں ایک بار وطن جانے کی چھٹی معہ تنخواہ اور الاؤنس کا مالک تھا عرب ملکوں کی ترقی کتنی کنواریوں کے نصیبے کھول رہی تھی دولت کی اس بوچھاڑ نے کتنے خاندانوں کو فراغت بخشی تھی۔ لڑکا نجیب الطرفین کھاتے پیتے خاندان کا تھا۔ کمائی میں حصہ بٹانے والوں کا بھی جھمیلا نہ تھا۔ ٹیلی فون پر بات پکی ہو گئی تھی۔ صورت شکل

کا ذرا ہیٹا تھا۔ قد بھی ذرا کم رہ گیا تھا۔ مگر کون سا بیٹی کو میاں کو کرائے پر اٹھانا تھا۔ مرد کی شکل صورت نہیں گن دیکھے جاتے ہیں۔ اور گن بارہ ہزار اور جملہ آسائشیں کچھ کم نہیں۔

بیٹی تھی بھی پھول جیسی۔ آگے پڑھنے کی ضد کرنے لگی۔ مگر اتنا اچھا موقع بار بار نہیں ملتا۔ ایک گھڑکی میں چپ ہو گئی۔ ایم ایس سی یا ڈاکٹری پڑھ کر کون سا تیر مارنا ہیں۔

ذرا خاموش رہی پھر ایک دم خاصی خاموش نظر آنے لگی۔ یہ لڑکیاں خواہ مخواہ نخرے کرتی ہیں۔ خط ایک طرف رکھ کر سوچ رہی تھیں۔ بس خالی کے مہینہ میں بیٹی سے ملنے دوبئی چلی جائیں انشاءاللہ حج کی برکتیں بھی حاصل ہو جائیں گی۔

مگر صدیقی صاحب نیم بیہوش سے کاغذ کے اس حقیر پرزے کو دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس نے ان کی دنیا کو آسمان سے گھسیٹ کر گہرے غار میں بیخ دیا تھا۔

"پاپا، ممی۔ مجھے بڑا دکھ ہے، مگر میں یہ شادی نہیں کر سکتی میں تشار ترویدی کے ساتھ الٰہ آباد اُن کے والد کے گھر جا رہی ہوں۔ ہم نے سول میرج کر لی ہے۔ مجھے معاف کر سکیں تو بڑے لعیب۔

آپ کی بیٹی ثمینہ ترویدی

خدا کی پناہ! صدیقی صاحب ماڈرن خیالات کے حامی تھے۔ لڑکیوں کو تعلیم دلانا، شادی ان کی مرضی سے کرنا۔ سب ہی کچھ مانتے تھے۔ عید بقر عید کی نماز بھی پڑھتے تھے۔ کبھی اسلامی اصولوں کے لئے جنگ و جدل کا واسطہ نہیں پڑا۔ نہ زندگی میں کبھی مذہب کی وجہ سے کوئی اڑچن جھیلنی پڑی۔ آزاد خیال غیر متعصب گروہ میں بڑی با عزت زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں بیٹی گمراہ ہو جائے اور ان کا خون نہ کھولے۔

بیگم کو جب شادی ملی تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

بس اب ایک ہی راستہ ہے الٰہ آباد جا کر دونوں کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ مگر بیگم تو پ

بندوق کے ذکر سے ہی ہولنے لگیں۔ ہائے اُن کی چاند سی اکلوتی بچی۔ خدا غارت کرے نامراد کو کیا بھولا بھولا دکھائی پڑتا تھا۔ ہر اتوار کو اودھم مچانے آجاتا تھا۔ ثمینہ سے ہر وقت تو لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ یہ کمبخت محبت کہاں سے پھاند پڑی۔ کیا مکار بچے ہیں آج کل کے ہوں میرج چپ چپاتے کرلی۔ فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ کیا ممی ممی کرکے لپٹتا تھا۔ آخر نابکار نے ممی بنا کر ہی چھوڑا یہ نسل کتنی مکار ہے۔ ہمیں انہیں ہندوں سے کوئی بیر نہیں ہے۔ ہر اتوار ہیلو کی بیٹھک جمتی ہے یاد بھی نہیں رہتا کون ہندو ہے کون عیسائی۔ بیویوں کے پیار کے نام بھی عجیب بڑنگے رکھے جانے لگے ہیں۔ پتی دلیش مکھ، آپ رزاق دلیش مکھ کی بیگم ہیں یارا چندر دلیش مکھ کی پتنی لالی کو وہ ہمیشہ عیسائی سمجھتی رہیں پتہ چلا اسمٰعیل رازدان ہیں۔ یہ رازدانوں میں کتنا گھپلا ہے۔ ترملا رازدان جو خود کو نکی کہتی ہیں، بات بات پر انگریزی گالیاں بکتی ہیں۔ ہر سانس میں شٹ آپ بات بات پر ہیل (،،،،) نگوڑی دودرخن بڑے بلند مرتبہ شیعہ خاندان کی نورِ نظر ہیں۔ اور رازدان صاحب محمد اسمٰعیل رازدان تین بار حج فرما چکے ہیں۔ خود بھی حجن ہیں۔ کیا لاجواب ساڑیاں اور میک اپ کا سامان لائی تھیں، آبِ زمزم کے کوزے اور تسبیح کے ساتھ غلافِ کعبہ کا انچ بھر کا ٹکڑا بھی دیا تھا۔ کیا صفائی سے ناخون کاٹنے کی قینچی سے بالشت بھر کا ٹکڑا غلاف کعبہ سے اڑا لائی تھیں اتنا جھولدار ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

آدھی رات تک بیٹھ کر شادی میں آنے والے مہمانوں کو تار ٹیلی فون سے اطلاع دی کہ لڑکی کو بڑا سخت نمونیہ ہوگیا ہے انٹینسیو کیر میں پڑی ہے۔ فی الحال شادی ملتوی۔ اگر زندہ بچی تو دیکھا جائے گا۔

اب بیٹی اور کمینے داماد کو قتل کرنے کے لئے کوئی تیز چھری بھی گھر میں نہیں۔ پستول کی تو بات چھوڑو۔ لائسنس کے ہزار لفڑے۔ کیا پتہ تھا ورنہ کوشش کی ہوتی تو مل ہی جاتا۔ بہت رسوخ

ہے اللہ کا دیا۔ جب تک پستول ملے گا نامراد کے بال بچہ ہو جائے گا۔ بال بچے کے خیال سے اور بھی خون کھدبدانے لگا۔

خیر اللہ نے یہ دو ہاتھ تو دیئے ہی ہیں۔ بیٹی کا گلا تو گھونٹا ہی جا سکتا ہے۔ تاک میں اس کی سسرال کے پاس جھاڑیوں وغیرہ میں چھپ کر بیٹھنا ہوگا۔ پتہ نہیں جھاڑیاں ہوں گی بھی گھر کے آس پاس۔ کمبخت گنجان محلہ میں نہ رہتے ہوں۔ اور یہاں تو یہ معاملہ ہے کہ ڈوبنے جاؤں تو دریا مجھے پایاب ملے۔ قسمت ساتھ دیتی تو بیٹی یوں منہ کو کالکھ لگا کر نہ بھاگ جاتی۔

مگر اس نامراد تشار کے بچے کی چھٹی نہ کی جو معصوم بچی کو بہکا کر لے گیا تو بڑی ناانصافی ہو گی۔ پیچ کش میں اگر دھار رکھوالی جائے تو کام بن جائے گا۔ دھار رکھنے والا پھانک کے سامنے روز آتا ہے، بیکار اُسے پولیس میں دینے کی دھمکی دے کر کسی دوسری کو مٹھی کے ساتھ اڈا جمانے کو کہہ دیا۔ کیا بھیانک کرکراتی آواز نکلتی ہے۔ دھار رکھتے وقت دانتوں میں جیسے کوئی مٹھی بھر ریت جھونک دے۔

یار دوستوں سے کہنے والی بات تو نہ تھی۔ مگر جواد تو گھر کے آدمی ٹھہرے۔ الہ آباد میں بڑی شاندار پریکٹس چلتی ہے۔ انہوں نے فون کیا کہ ان سے مشورہ کیا جائے۔ انہوں نے دوسرے دن شام کی چائے پر آنے کا وعدہ کر لیا۔

ادھر ایک طوفان پھٹ پڑا۔

اخبار میں جو الہ آباد سے انہیں خاص طور پر بھیجا گیا تھا۔ ان کی ثمینہ اور تشار کی شادی کی تصویریں تھیں۔ سول میرج سے مطمئن نہیں تھے۔ سیٹھ صاحب انہوں نے باقاعدہ آریہ سماج دھرم کے مطابق ہون اور پنڈت کی مدد سے شادی کی تصویریں چھپوائیں۔ لڑکی کو پہلے مذہب تبدیل کرتے دکھایا۔ پھر ہوائی جہاز سے بنارس جا کر اُسے گنگا میں ڈبکی دی گئی۔ پھر بھی بے حیا کس پیار

سے دانت نکوسے تشار کو تک رہی تھی۔

مارے غصہ کے صدیقی صاحب پر دل کا دورا پڑتے پڑتے بچا۔ اگر جواد صاحب نہ آجاتے۔ اس وقت تو قیامت برپا ہو جاتی۔ تشار کے باپ نے موقع کا بڑا ہی غلط فائدہ اٹھایا تھا۔ واکٹر مہاسبائی تھے۔ اور ان تصویروں کو بڑی شان سے چھپوایا اور صدیقی صاحب کے کٹے پر نمک چھڑکا۔

اب تو پورے کنبے کو بم سے اڑانا پڑے گا۔ کہاں ملتے ہیں۔ ہم صدیقی صاحب تو دیوالی شبرات پر پٹاخوں ہی سے بوکھلا جاتے تھے۔ مگر اس دھماکے نے ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ بے شک یہ ہندوؤں کا ملک ہے انہیں کتنی شاندار نوکریاں پاکستان سے آفر ہوئیں۔ اپنی حماقت میں اور بڑے ترقی پسند بنتے تھے اینٹھ دکھائی۔

"میں اپنا وطن نہیں چھوڑ سکتا۔ جس مٹی میں جنم لیا اسی میں دفن ہونا ہے۔"

لاحول ولاقوہ "جنم" نہایت ہندیانہ لفظ ہے انہوں نے قطعی جنم نہیں لیا۔ وہ ایک شریف متقی پرہیزگار سچے مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے۔

جواد صاحب نے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ دیر تک دونوں میں کمرہ بند کر کے باتیں ہوئیں۔ بعد میں بیگم کو بھی پوری اسکیم سمجھا دی۔ وہ بھی چہک اٹھیں۔ بھئی تگڑم باز ہو تو جواد صاحب جیسا۔ تھے تو ویسے شیعہ مگر برسوں کی دوستی تھی۔ صدیقی اور جعفری کی دوستی تاریخ کو گڑبڑاتی ہو مگر ان دونوں میں کبھی شگاف نہ پیدا کر پائی۔ انسان کا یقین اور دوستی میں اکثر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ مگر جیت اکثر دوستی اور محبت کی ہی ہو جاتی ہے۔ یہی زندگی کے تضاد کا المیہ ہے۔ یہ پیار و مروت اصولوں کا کیسا خون کرتے ہیں۔

صدیقی صاحب نے ٹیکسی کو ٹھہرنے کے لئے کہا اور میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔

چند لمحوں بعد ان کی لاڈلی ثمینہ ان کے سینے سے لگی آنسوؤں سے ہنس رہی تھی بیٹی والدین

سے نافرمانی کرنے کے بعد کیسی چور سی رہ جاتی ہے۔ جب تک معاف نہیں کی جاتی۔ روح ویران سی رہتی ہے۔ ماں باپ کے سایہ میں ہی تشار کا پیار دھیرے دھیرے پاؤں اس کے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کے والدین اتنے روشن خیال نہ ہوتے تو تشار ان کے گھر میں کیسے راس رچانے جاتے!

اور تشار کچھ نادم سا دانت نکوسے کھڑا تھا۔ اسے پاپا جی کا اخبار والا اسٹنڈ قطعی اچھا نہیں لگا وہ بھی چار بہنوں کا اکلوتا تھا۔ سیٹھ کا کریہ کرم ایک دن اسی کو کرنا تھا۔ وہ بار بار اسے یہی فرض یاد دلاتے تھے۔ اس کی بہنیں سب سے بڑی تھیں اور سب اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ ایک دفعہ چھوٹی والی نرمل ایک کالے کلوٹے عیسائی پروفیسر پر لٹو ہو گئی تھی مگر سیٹھ صاحب نے ایسی درانتی چلائی، لونڈے کو اڑنگا مار کر ولایت بھیج دیا۔ سرکاری اسکالرشپ دلوا کر۔ وہ سرپٹ بھاگا میدان عشق چھوڑ کر سیٹھ جی بڑے زبردست پالیٹشن میکر مانے جاتے تھے۔ انہوں نے خود کبھی کوئی پد قبول نہیں کیا لیکن اکثر صوبوں میں ان کے احسان مند اسمبلیوں اور مختلف کمیٹیوں میں آویزاں تھے۔ بڑے کامیاب "کنگ میکر" مانے جاتے تھے کسی خاص پارٹی سے وابستہ نہیں تھے مگر ہمیشہ جیتنے والی پارٹی کی پشت پناہی کرتے دکھائی دیتے۔ جنتا کے عروج میں بھی ان کا ہاتھ تھا اور زوال میں بھی۔ نہایت چوکھی تھی ان کی شخصیت نہ جانے جواد صاحب نے کیا جادو کا فیلتہ سکھایا تھا کہ صدیقی صاحب پہچانے نہ پڑتے تھے۔ ایک دم دل ہی سینے میں نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔

نہایت مصفا اور لطیف ہندی میں جس میں سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ ہیرے کی ڈلیوں کی طرح جڑے تھے۔ انہوں نے سیٹھ جی کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے کنیا کے بوجھ سے سبک دوش کر کے ان کی سات پیڑھیوں کو احسان مند بنا دیا۔ وہ دھرم کوئی بھی ہو سب

پوتر ہیں، اصل دھرم تو وہ پریم اور آدر ہے جو ایک روشن خیال سسر اپنی بہو کو دے سکتا ہے اپنا بیٹا ہی نہیں بہو کو اپنا دھرم بھی سونپ دینا بڑی مہنتا کا ثبوت ہے۔ اور گنگا تو کیا ہندو کیا مسلمان کیا عیسائی سبکی ماتا ہے۔ اس کا نرمل جل تو ذات نہیں پوچھتا اچھوت اور برہمن سب کے لئے اس کا چلو حاضر ہے۔

"سید" صاحب میں نے جنم انسان کے روپ میں لیا۔ دھرم ورثہ میں پایا۔ یقین دنیا کی کتابوں سے سمیٹا۔ آپ کا بھگوان اور میرا خدا ایک ہی طاقت کے دو نام ہیں۔"

صدیقی صاحب قرآن کے ساتھ گیتا اور بائبل بھی کوٹ کرتے رہے۔ سیٹھ جی بے حد مرعوب ہوئے۔ سیٹھانی نے بڑے اہتمام سے پڑوس کی مس روزا سے مرغ مسلم بنوایا۔ برادری میں دھوم مچ گئی۔ سیٹھ جی کا سمدھی بڑا متقی پرہیزگار مہمان و دودان بیٹی داماد کو اشیرباد دینے آیا تھا۔ کیا نوکروں کو پچاس پچاس کے نوٹ بانٹ رہا ہے۔ بڑی دعوتیں ہوئیں۔ جو صدیقی صاحب نے زہر مار کیں۔ مرغی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کہا ماس گھیان دھیان میں کھنڈت ڈالتا ہے۔

ارے بھئی آدھا مسلمان ہے۔ سو بھئی کتنے دن کا! لوگوں نے کہا۔

"آپ نے تو دل کے ارمان نکال لئے اب مجھے برادری کی دعوت کا بوجھ اتارنے کا موقع دیجئے ماں بھی دھاروں دھار رو رہی تھی۔ تصویریں دیکھ کر ڈھارس بندھی (حالانکہ بیگم نے تصویر پھاڑ کر چولہے میں جھونکنے کی رائے دی تھی)

بہو کو رخصت کرتے وقت سیٹھانی ذرا ہیرے کا سیٹ تھماتے ہچکچا رہی تھیں۔ سیٹھ جی نے ڈانٹ بتائی: "کتنے چھوٹے دل کی ہو، سمدھی بڑا دودان اور اونچے وچاروں کا مالک ہے۔ ہماری زیادتی کو کتنے مان سے قبول کیا۔ اور تم کانچ کے ٹکڑوں پر دم دیئے دے رہی ہو۔"

بڑی شان سے صدیقی صاحب بیٹی داماد کو دہلی لائے۔ فون کر دیا تھا۔ یار دوست ہار

پھول لے کر موجود تھے۔ جواد صاحب برکت کے لئے الہ آباد سے ساتھ آئے تھے۔

بیگم کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ ان کی تو رائے تھی "داماد کو قتل کر کے باغ میں کھاد بنا دو۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ ذرا دیکھتی جاؤ، ہم بھی کیا ڈرامہ کھیلیں گے۔ تشار ثمینہ کا شوہر ہے۔ ایجاب و قبول کسی بھی زبان میں کسی بھی مدد سے ہو انہیں زن و شوہر بنا چکا ہے۔ وہ دونوں ہمارے نورِ نظر ہیں۔"

شام کو شامیانہ پوری طرح سجایا گیا۔ شہر کے عمائدین ٹیلی فون اور موٹروں کی مدد سے گھر گھر جا کر مدعو کئے گئے۔

تشار سے جب مسلمان ہونے کو کہا گیا تو تھوڑی دیر کے لئے ٹپٹایا۔ سہم کر جواد صاحب اور صدیقی صاحب کو دیکھا اور شاید کھڑکی سے کود کر بھاگنے کا پروگرام بنانے لگا۔

"اباجی کیا بیہودگی ہے۔ پہلے پاپا نے مجھے ہندو بنایا۔ گنگا میں ڈبکی لگوائی۔ اڑگم بڑگم منتر بلوائے اب آپ یہ ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ ہم ہرگز آپ کی پالیٹکس کا تماشہ نہیں بنیں گے۔ ہم الہ آباد جائیں گے تو پھر ہمیں ڈبکیاں دی جائیں گی۔ یہ فوٹوگرافر ہماری تصویریں اتاریں گے . . . اور . . ."

بیگم رونے لگیں۔ صدیقی صاحب بڑبڑا گئے۔

"بس ایک ہی راستہ ہے" انہوں نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ہم دونوں جا کر جمنا میں ڈوب مریں۔"

"آپ کیسے ڈوبیں گے۔ آپ کو تو تیرنا آتا ہے۔ ممی کو ڈبو کر صاف نکل آئیں گے، وہ آپ کی گرل فرینڈ مس فرزانہ کی چاندی ہو جائے گی۔"

"چپ رہو شمی، تشار نے ڈانٹا" پاپا، میرا مطلب ہے صدیقی صاحب میں مسلمان ہونے

کو تیار ہوں ۔"

"شٹ اپ یو ایڈیٹ۔ میں ہرگز مسلمان نہیں ہونے کی۔ یاد ہے کس پیار سے ماتا جی نے مجھے یہ منگل سُتر پہنایا تھا۔ پتہ ہے ہیرے کا ہے۔ لگ می۔ کتنا پیارا ہے۔"

"یہ منگل سُتر تو مسلمان ہو کر بھی پہن سکتی ہے۔" تشار نے ڈانٹا۔

"اسے ان دونوں پاجیوں کو مار کے گاڑ دو۔ خدا غارت کرے۔ یہ ایسی نا ہنجار بیٹی۔ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے، یہ کمینی اڑچن ڈال رہی ہے۔"

"چپ بھی ہو گی ایڈیٹ کہ بس کہے ہی جائے گی۔ جب میں نے پاپا کا کہنا ٹالا تھا تو تو میرے کتنی خلاف ہو گئی تھی۔ کھڑکی سے کودنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ پتہ ہے کھڑکی کے نیچے چوہے کا بل ہے۔ یہ موٹی گھونس رہتی ہے۔ نکل آتی تو تیرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔"

"اے باہر مولوی صاحب بیٹھے سوکھ رہے ہیں۔ بیچارے نے چائے بھی نہیں پی بولے فرصت سے یہ مقدس فرض ادا کرنے کے بعد انشاء اللہ ناشتہ کریں گے۔ بہت ہی کھاؤ ہے ندیدہ!"

"میں تو تیار ہوں۔ دو طمانچے لگیں تو یہ ابھی راضی ہو جائے گی۔ ڈارلنگ ہندو ہو کر تیرا کیا بگڑ گیا۔ ایسی ہی اکڑ فون دھری ہے۔

"اُف اور جو میں نے تمہاری آرتی اتاری، تم نے اتنا سویٹ منگل سُتر پہنایا۔ مگر تم قطعی گندے موزے پہنتے ہو سخت بُو آئی جب میں نے تمہارے چرن چھوئے۔"

"پتی ورتا کا دھرم ہے کہ وہ اپنے پتی دیو کے موزے سونگھے۔ میرا مطلب ہے دھوئے پھر سونگھ سکتی ہے۔"

"یہ کیا مذاق ہو رہا ہے۔" صدیقی صاحب دہاڑے تم لوگ ہر بات مذاق میں اُڑا دیتے ہو

تشار تم مشرف بہ اسلام ہونے کو تیار ہو۔"

"جی مشرف، وہ مشرف حمید اللہ، نہایت کمینہ نیچ اور چور ہے۔ ہمیشہ نقل کر کے پاس ہوتا ہے۔ یاد ہے ثمینہ سر نے پکڑا تو چاقو نکال لیا۔"

"تم بیٹھ کے لاڈلے ہو، وہ غریب چپڑاسی کا لڑکا ہے۔ کتنا بڑا کمینہ ہے۔ کبھی سوچا ہے کیسے جیتا ہے مشرف۔" یو بلڈی کیپٹلسٹ بلڈسکر۔"

"دیکھئے ممی پھر بدتمیزی کر رہی ہے۔ پھر میں ایک ہاتھ دھر دوں گا تو۔"

"ارے مر گئے ہاتھ دھرنے والے۔ ہنہ۔"

"یہ بھنڈی کب تک ہوتی رہے گی؟" بیگم بولیں "اے ہے اون میں پڈنگ رکھ کے بھول آئی۔" وہ لپکیں کچن کی طرف۔

"بھئی یہ بچے تو مجھے پاگل کریں گے۔ بھئی جواد....."

"وہ کیا؟" جواد بیٹے سن رہے تھے باتیں۔ مسکرا رہے تھے۔ "بھئی یہ سب تمہاری رائے سے ہی کر رہا ہوں۔ اب بتاؤ کیا کروں۔"

"آپ مجھے تو جھٹ پٹ مسلمان کر لیجئے، میٹنی کے ٹکٹ بک کرائے ہیں۔ تین بجے پہنچنا ہے۔"

"ادھر مولوی بھوکا ہماری جانوں کو کوس رہا ہے۔ تم لوگ میٹنی چھوڑو۔ شام کو ایٹ ہوم ہے۔"

"وہ تو آٹھ بجے ہے۔"

"پھر بھی صدیقی صاحب کی ہر چال پٹ رہی تھی۔"

"سنو بچو۔" جواد صاحب کھنکارے۔"

"جی چاچا۔" تشار بڑی مستعدی سے بولا۔

"تم نے سول میرج کی تھی ؟"

"جی ہاں سارٹیفکیٹ اڈا آباد ماں نے سیف میں رکھ دیا۔"

"تم نے فارم پر دستخط کرنے سے پہلے فارم اچھی طرح پڑھ لیا تھا؟"

"جی پڑھ تو لیا تھا۔ مگر ثمینہ بڑی گھبرا رہی تھی۔ میں نے کہا جلدی سے دستخط کرکے چھٹی کرو۔"

"تمہارا فونٹین پن بنڈل ہو تو کیسے جلدی سے دستخط کر دیتی۔ جوتے تو درجنوں خریدتے ہو۔ قلم اتنا پھیٹچر۔"

"دیکھئے کتنی بدتمیزی سے بات کرتی ہے۔ دو دفعہ ہوئی ہے شادی پہلے سول میرج پھر پھیروں کی شادی۔ میں تو صاف انکار کر رہا تھا مگر آپ کو پھیروں کی شادی بڑی رومینٹک لگ رہی تھی۔ پاپا اور ماں جی کو مسکہ لگانے کے لئے بس ہر بات میں میری کاٹ۔"

"پھیروں کی شادی جیسی رومینٹک اور کیا شرم شرم پنڈت منتر پڑھ رہا تھا۔ پاپا نے ڈھیروں اصلی گھی بھر بھر چمچہ ڈالا۔ بالکل ایسی خوشبو آرہی تھی جیسے گاجر کا حلوا بھوننے سے آتی ہے۔ ویری سویٹ۔"

"چھی، کبھی مرگھٹ میں اصلی گھی چتا پر جلتا سونگھا ہے ؟"

"یو بلڈی بیڈ سسٹ" ثمینہ نے اخبار کی پھکنی بنا کر تشار کے سر پر پھٹا پھٹ ماری۔

"شٹ اپ۔"

"اُفوہ یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

"ذرا مجھے بات کر لینے دو۔" جواد صاحب بڑی نرمی سے بولے۔

"اندھیر ہے کہ نہیں، یہ بحر بحر کب تک چلے گی۔" بیگم نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سنو بچو، اور وعدہ کرو بیچ میں بدمزاقی نہیں ہوگی۔ یہ بہت اہم سوال ہے جو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم نے سول میرج کے فارم پر دستخط کرنے سے پہلے وہ کلاز پڑھ لیا تھا جس میں درج ہے کہ تم دونوں کا کوئی مذہب نہیں؟"

"نہیں پڑھا تو نہیں تھا۔ مگر پڑھ لیتے پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا چاچا جی۔ جو ماتا پتا نے بتایا ہم نے وہی کر دیا۔ سچ پوچھئے تو مذہب کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ مذہب تو بڑے بوڑھوں کا ہوتا ہے۔ کانونیٹ میں تو ہم عیسیٰ مسیح کی بھیڑ تھے۔ متھرا گئے تو وہاں کرشن جی کا راج تھا۔ مشرف ایک دفعہ درگاہ بھی لے گیا تھا۔ اور اس کی نقل میں میں نے ہاتھوں کا چلو بنا کر بدبدہونٹ بھی ہلائے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے کبھی سنجیدگی سے سرلیس لی خدا، بھگوان ایشور کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"

"آہ.... وہ.... دلیپ کمار کے بارے میں سوچتے ہو؟"

"ماتا جی کبھی ان کی فین تھیں۔ ہمیں تو ایسٹ پسند ہے اور متھن اور...."

"بس کافی ہے مگر اس کا مطلب ہے جب تک تمہاری سول میرج ڈذالونہ ہو جائے کوئی دوسرے طریقہ سے کی ہوئی شادی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"یعنی جو پھیروں کی شادی ہوئی وہ پھٹ!" تشار چہکا۔

"نان سینس" تشی بابا تم پھیروں کے پیچھے بیکار ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ یہ منگل سُتر دیکھ رہے ہو۔ شوق سے مجھے طلاق دے دو مگر یہ ہرگز واپس نہیں ملے گا۔"

"اوہ کتنی چھچھوری لڑکی ہے۔ اتنی سرلیس لی باتیں ہو رہی ہیں، بیچ میں منگل سُتر پھاند پڑا۔ سچ بتاؤ اگر تمہیں پہلے سے ماتا جی نے منگل سُتر اور گہنے نہ دکھا دیئے ہوتے تو تم کبھی پھیروں

کی شادی کے لئے تیار نہ ہوتیں۔"

تم بے حد حسین ہو۔ کمینے، مجھے اتنا چھچھورا سمجھتے ہو۔ پاپا میرا نکاح کر دیجئے۔ کسی بھی کاٹھ کے اُلّو سے میں نے اس ایڈیٹ کو پردان ناتھ بھی کہا۔ اس کے بدبُودار موزوں والے چرن بھی چھوئے وہ یہ..... یہ.... اوہ مائی گوڈ" ثمینہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر تشار پر لپکی۔

"اگر بیگم ہسٹریا کا دورہ ڈالنے کی دھمکی نہ دیتیں تو مارا ماری ہو جاتی۔

" جواد یہ جو نئی اڑچن تم نے نکالی ہے میں اُسے قطعی نہیں مانتا۔

"مگر قانون، شاید...."

"گولی مارو قانون کو مجھے سیٹھ جی کی ہیکڑی کا جواب دینا ہے۔ نکاح ہوگا چاہے مجھے جیل بھگتنی پڑے پھانسی بھی ہو جائے تو پرواہ نہیں۔ انہوں نے میری جگ ہنسائی کی۔ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"لوگو مجھے بھی تو معلوم ہو نکاح میں اڑچن کہاں سے آن پڑی۔ یہ کیا قصہ ہے؟ جب دونوں مسلمان ہو جائیں گے تو پھر...."

"بھئی ٹھیک کہتے ہیں بیگم۔ آخر مولوی کی بیٹی ہیں"

"اور رمی میں سب کا پتہ کر دیتی ہیں" ثمینہ نے لقمہ دیا۔

"چپ رہ بدذات۔ ہر بات میں لقمہ دیتی ہے۔"

قاضی صاحب تشریف لائے۔ ثمینہ نے ہنسی روک سنجیدگی سے سر ڈھک لیا۔ تشار کو فوٹوگرافر نے اپنی قراقلی ٹوپی پیش کر دی جو وہ حال ہی میں پاکستان سے لایا تھا۔ اس کا بانکپن دیکھ کر ثمینہ کی آنکھوں میں پریاں ناچ اٹھیں۔

دونوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عربی آیت کی ادائیگی میں دونوں ہی کو مشکل پیش آئی۔ تشار

کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ قاضی صاحب بے انتہا خوش اخلاق تھے۔ سماں بندھ رہا تھا۔ وکیل اور گواہ کے لئے ایک تو جواد صاحب تھے ایک شخص اور چاہیئے۔

"امی کو بنا دیجئے وکیل۔"

"ایک عورت کی اور ضرورت ہوگی۔"

"وہ کیوں؟"

"ایک مرد، دو عورتوں کے برابر مانا جاتا ہے۔ شکورا لے لیجئے۔"

"امی تو دس شکوروں پر بھاری ہیں، یہ ناانصافی ہے۔" ثمینہ اکڑ گئی۔

"اسے ہے چپکی بیٹھ لڑکی، بات بات میں ٹپک پڑتی ہے۔ آپ لڑکی کے باپ ہیں۔"

"میں گواہ بن سکتا ہوں؟" صدیقی صاحب چونکے۔

"بے شک!" قاضی صاحب کچھ مکدر سے بیٹھے تھے۔ ان کوٹھی بنگلوں میں رہنے والوں کا ہر پہلو اونگا بونگا ہوتا ہے۔ یونٹی میں پروفیسر ہیں۔ مذہب کے نام پر صفر۔ خیر نکاح ہو گیا۔ چھوارے بٹ گئے۔ فوٹوگرافر نہایت چابکدستی سے باریک باریک موقعوں کی تصویریں لے رہا تھا۔ دستخط کرتے وقت کلوزاپ، وقت نہیں تھا۔ ورنہ فلم نہایت شاندار تیار ہوتی۔ سیٹھ جی کے دل پر چھریاں چل جاتیں۔

دوسرے دن دھڑا دھڑ اخباروں میں فوٹو چھپے ساتھ ہی یہ بھی خبر چھپی کہ دولہا صبح کے پلین سے بمبئی روانہ ہو گئے۔ وہاں سے انگلینڈ اور واپسی پر انشاءاللہ حج کر کے لوٹیں گے۔

رات گزارنے کے لئے دولہا دولہن اشوکا ہوٹل میں ٹھہرا دیئے گئے۔ سب پہنچا ئے گئے۔ دو ڈیڑھ بجے آکر بے سُدھ پڑ گئے۔ آج صدیقی صاحب کو معلوم ہوا بیٹی کا بیاہ آسان نہیں۔ اسی دن کے خوف سے والدین لرزتے ہیں۔ فتح مندی کے احساس سے جی ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔

جواد صاحب نے واقعی بات کو کتنا حسین موڑ دیا۔ اب تک تو اخبار پہنچ گیا ہوگا۔ سیٹھ صاحب کے ہاتھوں میں۔ تڑکے اُٹھ کر اشنان پھر پراتھنا کے عادی ہوں گے۔

جی ہی جی میں صدیقی صاحب خوش ہو رہے تھے۔

"ارے سیٹھ صاحب کے سمندھی جی، کچھ ناشتہ واشتہ ملے گا؟" جواد صاحب نے دروازے سے ہی ہانک لگائی "بھئی ایسا لگتا ہے بالشت بھر قد بڑھ گیا تمہارا۔ واہ میاں کیا شان ہے؟"

"بالشت بھر نہیں۔ گز بھر کہئے۔ بڑے موزی کو مارا ہے بخدا۔ چھپٹا رہا ہوگا۔ ارے بھئی ناشتہ اشو کا چل کر کیوں نہ کیا جائے؟"

"کیا بات ہے؟"

"بیگم کیا رائے ہے؟"

"مجھے کیا دیر لگتی ہے تیار ہونے میں۔"

تینوں پہنچے ہوٹل۔

"صاحب وہ تو گئے!" کاؤنٹر کلرک نے بتایا۔

"گئے؟ کہاں گئے؟ کب؟"

"ادھر آپ لوگ رخصت ہوئے ادھر انہوں نے ٹیکسی منگوائی میں نے بہت کہا آپ لوگ کل شام تک ٹھہر سکتے ہیں۔ مگر۔ ٹیلی فون پر بات ختم۔۔۔"

"ٹیلی فون؟ کیسا ٹیلی فون؟"

"جی وہ الہ آباد۔ میں نے خود کال ملا کے دی سر۔ سیٹھ۔۔۔۔"

"سیٹھ!۔۔۔" تینوں سناٹے میں رہ گئے۔ ہوں تو ہمیں جل دے گا۔"

"کیا کہتے تھے الہ آباد جا رہے ہیں؟"

"نہیں سر ایسا تو کچھ نہیں بولا....."

"پھر طوفان کھڑا کرے گا..... کمینہ.... کیا تشار نے کال کی یا....؟"

"جی ہاں، دونوں نے، مطلب ہے بیبی ممی ٹیلی فون بوتھ میں ساتھ تھیں۔ کوئی پچیس منٹ بات ہوتی رہی۔ ارے ہاں، ایک خط دے گئے ہیں۔ کہ آپ کو پہنچا دیا جائے" لفافہ کافی دبیز تھا۔ یا شاید صدیقی صاحب کے ہاتھوں میں دم نہیں رہا تھا۔

خط انگریزی میں تھا۔ اور دو ہینڈرائٹنگ میں تھا۔ ثمینہ اور تشار نے باقاعدہ تقسیم کرکے ایک ایک جملہ لکھا تھا۔

پیارے پاپا، ممی انکل جیؔ لو

اسی میں بہتری ہے کہ ہم لوگ چلے جائیں۔

نہیں الہ آباد نہیں، کیونکہ وہاں بھی ایک عدد ضدی باپ اور آنسوؤں سے مسلح ماں ہماری گھات میں ہیں۔ ہم نے اچھے بھلے انسانوں کی طرح چار سال ایک دوسرے کو پرکھا پہچانا اور پیار کیا۔ پھر بڑے سوچ بچار کے بعد سول میرج کی۔ میں کچھ زیادہ بہادر نہیں مگر شمی نہایت ڈرپوک ہے۔ بالکل جھوٹ میں نے تو اسی وقت رائے دی تھی کہ بس دور کہیں مدراس دوراس بھاگ چلو۔ اس لئے میں نے الہ آباد فون کیا۔ ہمارے پتاجی نے بڑے پیار سے ہمیں فوراً الہ آباد آنے کو کہا کہ ماتاجی بڑی رو پیٹ رہی ہیں۔ انہیں آکے سمجھاؤ۔ وہاں گئے تو انہوں نے پھیرے ڈلوا دیئے۔ ہم نے سوچا کیا جاتا ہے پڑ جانے دو۔ پھر انہوں نے اور نگر میں چلائیں۔ سو ہم نے وہ بھی سہہ لیں۔ پھر آپ آئے۔ پاپا آپ بہت کمال کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔ کیسے میٹھے منہ سے پتاجی کو پرچایا۔ سچ پاپا میرے تو آنسو نکل آئے۔ کتنی براڈمائنڈیڈ ہیں میرے پاپا۔ بھی ہمارے پتاجی نے سکوٹ کری اپنے چیلے چپاٹوں سے اور ہمارا کھیل بنایا بنارس لے گئے۔ یہ سچ میں شمی بہت

گڑبڑ کرتی ہے۔ آپ سے پہلے تو پتاجی نے ہم پر جادو کی چھڑی گھمائی۔ مگر جب آپ نے اتنے بڑے دل سے ہمیں معاف کر دیا اور دہلی لے آئے تب پتہ چلا آپ کتنے ننھے منھے سے نکلے آپ نے ہمیں پھر بندر بندریا کی طرح نچایا۔ ہم نے سب ایک مسخری کامیڈی مان کر کھیل لیا وہ ناٹک بھی۔ مگر ایسے نہیں ہم نے پتاجی پر آپ کا بھید نہیں کھولا کل صبح اخبار کے ذریعہ بم پھٹے گا ہم نے بس انہیں دہلی سے گڈبائی کیا۔ اور آپ کی سیوا میں بھی خدا حافظ۔ کیونکہ ہم جا رہے ہیں۔ جان بھی دیجئے کیا کریں گے معلوم کر کے پاپا تشار اتنا میٹھا بول رہا ہے مگر اس نے آپ کو بڑے بڑے نام دیئے اپنے آپ کو بھی میڈبل بولا۔ یعنی پاگل بھینسا۔ اگر ہم نے آپ کا دل دکھایا تو معافی۔ جی نہیں ہم نے بالکل دل نہیں دکھایا، معافی تو ہم سے آپ کو مانگنا چاہیئے آپ نے ہمارا خوب تماشا بنایا۔ اچھے والدین ہیں آپ لوگ جو اپنی اولاد کو بندریا کی طرح جس تال پر چاہتے ہیں نچاتے ہیں۔

میں نے پاپا جی سے کہہ دیا اور آپ بھی سُن لیں ہمارا کوئی ایک مذہب نہیں سارے مذہب اس بھگوان نے بخشے ہیں۔ پوری انسانیت کی دولت ہیں۔ اسے گوڈ بھی کہتے ہیں۔ آپ اسے صرف خدا کے نام سے پہچانتے ہیں۔ مگر ہم اسے پہچانتے ہیں ہزاروں ناموں سے۔ وہ جو کن کن میں رچا ہوا ہے۔

جو رحم والا اور مہربان ہے۔ (قرآن شریف)
جو اندر بھی ہے۔ باہر بھی
اوپر بھی۔ نیچے بھی۔
اندھیرے میں بھی اُجالے میں بھی
حاضر میں بھی غائب میں بھی

نائیں بھی۔ہاں میں بھی۔ (بھگوت گیتا)

آخر میں دونوں کے دستخط تھے۔

بیگم تو ٹسر ٹسر رونے لگیں۔ صدیقی صاحب عورتوں کے رونے پر نہایت تیر بہ ہدف جملے مرتب کر رہے تھے۔

اور جوآد صاحب بڑے ہی انہماک سے اپنا پائپ کرید رہے تھے شاید اس میں گھس کر فرار کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ کیونکہ یہ جالینوس نسخہ انہیں نے مرتب کیا تھا۔ نہ جانے کونسا جزو ناسازگار شامل ہو گیا تھا۔ جو معجون بھک سے اُڑ گیا۔ اور دو جوڑی والدین کی دنیا سونی کر گیا۔

❖

اندھا یُگ

"میرا نام بابو لال ہے۔"

"آیئے، تشریف لایئے۔"

اس کے چہرے پر تناؤ چھا گیا۔ جیسے میں نے کوئی گالی دے دی ہو۔

چھریرا بدن، دراز قد گہری سانولی رنگت اور بے حد پھرتیلی قدرے سرخ بڑی بڑی آنکھیں ستوان ناک، پھیلا ہوا گہرے ادوے ہونٹوں والا دہانہ، سر پر خم دار کھچڑی بالوں کا ٹوکرا۔

مجھے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کبھی جھجک محسوس نہیں ہوتی مگر بابو لال کچھ ایسا بھنایا ہوا تھا کہ مجھے بھی تکلف ہونے لگا۔

"پوار صاحب نے بھیجا ہے۔"

ادھر، یہ پولیس والے کتنے بھی نرم مزاج نظر آئیں، ڈیوٹی پر ننگی تلوار بن جاتے ہیں۔

مجھے خاموش پاکر بابو لال کی کچھ ہمت بڑھ گئی۔ ذرا نرم ہو کر بولے۔

"آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں!"

"میں اس دنیا کے بارے میں کچھ جانکاری چاہتی ہوں۔ جہاں میرا گزر ممکن نہیں۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر وہ عورتیں ہم جیسی عورتوں سے بدظن ہوتی ہیں۔ کبھی سچ نہیں بولتیں۔ بس دکھڑا رونے لگتی ہیں۔ زیادہ تر تو فلم لائن کے چکر میں آتی ہیں اور دروازوں کے ساتھ میرا بھی دروازہ کھٹکھٹا لیتی ہیں۔ عموماً جن کا وقت ختم ہونے لگتا ہے وہ بیٹی کو ذرا بہتر حالت میں دیکھنے کی آرزو میں ہوتی ہیں۔ اور ریکھا یا ہیما مالنی بنانے کے خواب دیکھتی ہیں۔"

"یہ فلم لائن کوئی کم برا تھل ہے۔"

"ویسے تو پوری دنیا ہی ایک برا تھل ہے۔ کیا نہیں اس بازار میں بکتا۔ جہاں خدا بکتا ہے وہاں انسان کا ماتم بے کار ہے۔ نہیں بابو لال جی۔"

"میرا نام محمد شکیل ہے۔ مارکٹ میں بابو لال۔"

"شکیل میاں، میں کچھ بھی ہوں۔ بس فراڈ سے دور ہوں۔ میں اس پیشہ کی اخلاقی پستی کے بجائے اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہوں۔ کیا خیال ہے آپ کا! کیا موجودہ سیٹ اپ میں برا تھل..... میرا مطلب ہے جسم کا بیوپار وقت کی ضرورت پوری نہیں کرتا؛ جیسے باتھ روم!"

"اپنے کام کی بات کہی۔" بابو لال ذرا بے تکلفی سے ہنسے۔

"شربت یا چائے!"

"شربت چلے گا۔ کوئی بڑا کاروباری شہر بنا رنڈی خانوں کے نہیں چل سکتا۔

"جبھی تو سماج سدھار کے دعویدار سینہ کوبی کرتے ہیں۔ مگر کچھ کرتے نہیں؟"

"کرتے کیا نہیں، کر ہی نہیں سکتے۔ سب کا ناتا جڑا ہوا ہے۔ یہ رنڈی خانے ہم جیسے ٹٹ پونجیوں کے نہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کے ہیں جو پولیس اور سرکار کی چھتر چھایہ میں پھلتے پھولتے ہیں۔

"یہ چھاپے جو پڑتے ہیں؟"

—"سب دکھاوے کے لئے۔ ہفتہ بندھا ہوا ہے کبھی کسی بڑے گاہک کے بل پر کوئی اکڑ دکھاتا ہے بس چھاپہ پڑ جاتا ہے۔"

"قانون کہتا ہے رنڈی کا پیشہ جرم نہیں۔ رنڈی کی کمائی کھانا جرم ہے۔"

"یہ لیجئے۔ رنڈی کوئی نگوڑی ناٹھی ہوتی ہے، اس کا بھی کنبہ ہوتا ہے۔ اپاہج باپ، نکما بھائی بیمار ماں — اور صاحب تندرست بھی ہوں تو پیٹ سب کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اور پھر دلال بنا رنڈی کتنے دن جی سکتا ہے۔ پہلی فرصت میں شادی کا وعدہ کر کے بھگا لے جاتے ہیں اور خود کمائی کھاتے ہیں رنڈیوں کی۔"

"کوئی بھی ایسا نہیں جو واقعی ان سے ہمدردی رکھتا ہو، پیشہ سے نفرت کرتا ہو۔"

"ایسے گدھے اپنے بمبئی میں تو دکھائی نہیں پڑتے۔ آئے دن چھوکریاں بھاگتی رہتی ہیں۔ وہی مثل ہوتی ہے کڑھائی سے نکل کے چولہے میں۔"

"یہ آرام طلبی کا پیشہ نہیں؟"

"ہے بھی اور نہیں بھی بس یہ سمجھ لیجئے، یہ بھی طبقاتی، میرا مطلب ہے جیسے سیٹھ اور مزدور

اوپر والیاں راج کرتی ہیں اور گری پڑی جاہل پھر ڈھوتی ہیں۔"

"کیا پڑھی لکھی بھی ہوتی ہیں؟"

"کیوں نہیں صاحب، بڑے شہروں میں اونچے طبقے کے رنڈی خانوں میں فٹافٹ انگلش بولتی ذرا اینگلو چلبلی کی بڑی مانگ ہے۔ ویسے جوان اور گوری بھی چلتی ہے۔ پر ذرا طراز مینش لیول ہو تو گاہک اس پر زیادہ ہی جلدی ریجھ جاتا ہے۔ رنڈی بس صورت سے ہی نہیں چلتی۔ تھوڑی بدھی بھی چاہیئے۔"

"شکیل تم اس کاروبار میں کیسے پھنس گئے؟"

بابو لال پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ مجھے ڈر لگا اُٹھ کے چل دے گا۔ مگر پھر وہ میری پریشانی بھانپ کر مسکرایا اور صوفہ پر آرام سے ڈھلک گیا۔ اس کی سُرخ آنکھوں میں غم اور غصہ عود کر آیا۔ پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

"اگر اس سوال سے آپ کو...." میں پھر تکلف پر اُتر آئی۔

"مجھے آپ نہ کہیئے، تکلف ہوتا ہے۔" وہ اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"میں چھوٹا سا تھا، کتنا چھوٹا۔ کوئی چار پانچ کا سن ہو گا میرے ابا انتقال کر گئے۔ اماں اس وقت انیس بیس کی ہوں گی۔ کانٹا چبھ گیا تھا، یا کوئی کیل ہو گی۔ تین دن میں ختم ہو گئے۔"

"ٹیٹینس؟"

"جی وہی رہا ہو گا۔ اس کے بعد بس اتنا یاد ہے کہ میری اماں نوکرانیوں کی طرح کام کرتی تھی۔ بات بات پر مار پیٹ اور گالی گفتار، تہمتیں سوانگ، ناذ بُرا حرامزادہ تھا۔ اندھیرے اُجالے

اماں کو۔۔۔" وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش ہو گئی۔ جہاں دُور سرچ میں وہ بیتے دنوں میں بھٹک رہا تھا۔ میرا تخیل بھی دوڑنے لگا۔

"پھر ایک دن اس نے اماں سے نکاح پڑھوا لیا۔ بس پھر تو وہ لٹھ چلے کہ خدا کی پناہ۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ کچھ پلّے نہیں پڑتا تھا۔ تائی نہ جانے کیوں میری بھی دشمن ہو گئی تھی۔ اور بات بے بات طمانچے جڑا کرتی۔ تاؤ بھی اس جوتم پیزار سے تنگ آ کر بس سانڈ کی طرح جو سامنے آجاتا اسی کو دھنک کے رکھ دیتا۔ پی کر آتا اور دونوں بیویوں کی کندی کرتا۔ ایک دن میں نے سالے کی پنڈلی میں کاٹ کھایا۔ بابو لال ہنس پڑا۔

"اماں کو جھانکڑے سے مار رہا تھا۔ جھانکڑ جانتی ہیں کیا ہوتا ہے۔ ببول کی خشک ڈالی۔"

"ہاں ہاں، اماں سویاں توڑ کر سکھایا کرتی تھیں جھانکڑوں پر۔ مگر ان میں کانٹے تو نہیں ہوتے تھے۔"

"ببول کی نہ رہی ہوں گی۔ ببول کے کانٹے تو بس گوشت میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر گوشت سڑنے لگتا ہے۔ بس میں بھاگ کھڑا ہوا۔ تین چار سال تو جھیلا، پھر چلی نہیں گاڑی۔ ایک مہینہ میں بمبئی پہنچا۔ بمبئی کا بہت ذکر ہوتا ہے۔ ادھر رجن پور سے کتنے لوگ آئے ہیں پرتاپ گڑھ کے ضلع میں ہمارا گاؤں ہے۔

"رجن پور۔"

"کیا پیدل ہی آئے؟"

"نہیں جی، پرتاپ گڑھ کی طرف تو پیدل ہی چلا تھا۔ راستہ میں کبھی بیل گاڑی کبھی چھکڑے

میں جگہ مل گئی، بس بھی چلتی ہے۔ کتنے دن میں تو پرتاپ گڑھ پہنچا۔ وہاں سے ریل پکڑی۔ دادی نے وضو کرتے وقت فیروزہ کی انگوٹھی اتار دی۔ وہ گئی سجدے میں اپن نے پار کر دی اور بھاگ لئے۔ کیسی روئی ہو گی دادی۔ وہ تو پرتاب گڑھ میں ہی چپک گئی۔ ریل میں بیٹھا۔ اگلے اسٹیشن اتار دیا گیا۔ رات کو زیادہ پکڑ دھکڑ نہیں ہوتی۔ بس یونہی چلتا رہا۔ فرسٹ کلاس سے کھانے کی بڑی ٹرے میں اچھی خاصی جھوٹن مل جاتی تھی۔ خوانچے والے بھی کبھی باسی پوری دے دیتے۔ ایک قلی تو مجھے گود لینے پر تلا تھا۔ بے اولاد ہو گا سالا مجھ سے مزدوری کرانے کا پلان ہو گا۔ بمبئی پہنچا تو گھگی بندھ گئی۔ بھیک مانگنا لوگ بڑا آسان سمجھتے ہیں۔ ارے بھیک کے اڈوں پر قبضہ ہوتا ہے کسی نہ کسی کا۔ باہر والے کی بڑی مرمت ہوتی ہے۔" بابو لال نے سگریٹ سلگائی میں نے بھی مسکہ مارنے کے لئے ایک مانگ لی

"ایک بات بتاؤں، سگریٹ مانگنا سخت یاری اور براری کا ثبوت ہے۔" بابو لال نے فوراً جوتے اتار کر پیر میز پر پھیلا دیئے اور سر خوب زور زور سے کھجایا۔ آواز دار جمائیاں لیں تو چہرے کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"بمبئی سنٹرل جیل کے گیٹ پر کھڑا رو رہا تھا کہ ایک بھلے آدمی کو رحم آ گیا۔ غور سے دیکھا۔

"اعظم گڑھ کا ہے چھوکرے؟"

"نہیں رجن پور۔ پوسٹ کنڈہ۔"

"اچھا۔ اچھا پرتاپ گڑھ کا۔" وہ تھوڑی دیر پر تولتا رہا۔ پھر جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ "جا پہلے ادھر" ہوٹل میں روٹی کھا۔ پھر وہ سامنے کپڑوں کی فٹ پاتھ پر ڈھیری میں سے ایک نیکر اور بنیان خرید اور ربڑ کی چپل، برسات میں ٹھیک رہے گی۔ اور دیکھ تیرا جی چاہے

تو بھاگ جا۔ دس روپے اپن کے لئے کوئی بات نہیں۔ ادھر کرائے کی دکان ہے نا، نکڑ سے آگے چل کے ادھر آجانا۔ مار پیٹ نہیں چلے گی، کام چاہیئے کام ملے گا۔"

ان دنوں ۱۲ آنے کی چپل ملتی تھی۔ ڈیڑھ روپیہ کا نیکر اور آٹھ آنے کی بنیان، چودہ آنے میں پیٹ بھر پوری بھاجی اور دو جلیبی۔ نیکر کی جیب بار بار ٹٹولتا تھا کہ پیسے چھن چھنا رہے ہیں کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ دس بارہ دن وہ مجھے سے کے شہر میں گھومتا رہا تب اتنے مالوں کی بلڈنگیں نہیں تھیں پر گیٹ وے، تاج محل اور پھیلا ہوا سمندر دیکھ کر چکرا گیا۔ مجھے یاد ہے پہلی فلم اپریل میں دکھائی بندو بھائی نے۔ یہی نام تھا اس کا۔ میں تو قلابازی کھا گیا۔ کام تو بندو بھائی نے کچھ نہیں دیا۔ میں نے پوچھا تو بولا "کیوں مرا جاتا ہے۔ ساری عمر کام ہی کرے گا۔ ذرا گھوم گھام لے۔

بندو بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا نام ہرگووند تھا۔ ہم لوگوں کے ایسے نام ہوتے ہیں جس میں کچھ جات پات کا پتہ نہیں چلتا۔ دھندے میں اڑچن پڑتی ہے۔ اور پھر خدا مجھے یاد ہی کب تھا جو بھولتا۔ پر بندو بھائی مندر جاتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ اور اس کی نقل میں میں بھی آٹھ دس ٹا جوڑ کے پرساد لے لیتا۔ چونّی، اٹھنّی گلّے میں ڈال دیتا۔ ایسے دھندے میں پوجا پاٹ سے بڑا سہارا ملتا ہے۔ مسجد میں جاکر دو رکعت نماز پڑھ لیں۔ روح پاک ہو جاتی ہے۔"

"مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟"

"جی، تھی کیوں نہیں۔ ان دنوں نیا نیا پارٹیشن ہوا تھا۔ تقی بھائی ادھر کلابہ میں دھندا چلاتا تھا۔ کلابہ پوش ایریا ہے۔ تقی بھائی بھی پوش آدمی تھا۔ اس کی ایک ہیر کٹنگ سیلون بھی تھی۔ دھندا چھوڑ دیا تھا مگر جہازی گورے ادھر آتے جاتے تھے لیکن انہیں اونچا مال سپلائی کرنا کوئی نیچ کام نہیں

اس کے علاوہ اس کا پرائیویٹ بھی چلتا تھا۔"

"پرائیویٹ! یعنی!"

"اب آپ کیا سمجھیں گی۔ بڑا الجھا ہوا معاملہ ہے۔ بعض سیٹھ لوگ مال اپنے فلیٹ میں منگواتے ہیں۔ دس بارہ چھوکریوں کا آرڈر ملتا ہے۔ ہائی کلاس مال۔ بازار نہیں گھریلو مال۔"

یا خدا۔ یہ گھریلو مال کیا ہوتا ہے۔ میں چکرا گئی۔ تھوڑی دیر بابو لال الفاظ تولتا رہا۔ پھر ایکدم بولا۔

"جب سیٹھ لوگ اونچی پارٹیاں کرتے ہیں تو تین دن راتیں ہوٹل میں گزر جاتی ہیں۔ گھر پر کہہ جاتے ہیں۔ بزنس کے سلسلہ میں جا رہے ہیں۔ مہینے میں ایسی کئی پارٹیاں ہو جاتی ہیں۔ سیٹھ تھک جاتے ہیں گھر میں سے .... یعنی نوجوان بکرا دھیڑ بھی جو دم دار ہوں ایسی پارٹیوں میں شرکت چاہتی ہیں۔ ان کا "کوا پریشن" ملتا ہے۔

"وہاں پتی دیو سے مٹ بھیڑ ہو جائے تو؟"

"نہیں صاحب۔ بڑی محتاط ہوتی ہیں۔ پوری خبر رکھتی ہیں۔"

"افوہ، تو ہو سکتا ہے ایک صاحب کی بیوی دوسرے کے پاس اور دوسرے صاحب کی بیگم ان صاحب کے پاس۔"

"ہو سکتا ہے۔ یہ اَدل بدل تو سُنا ہے یورپ میں بہت چل رہی ہے۔ یہاں بھی ہو جائے گی اور کون جانے ہو بھی گئی ہو۔ ہم کو کیا لینا ان چکروں میں پڑ کے، ہمارا دھندا نہایت سیف ہے۔ ہاں کبھی پی پلا کر دنگا مچ جاتا ہے۔ چھری چاقو نکل آتے ہیں۔" بابو نے بڑے تکلف سے کٹکے دار چاقو نکالا اور ہتھیلی پر تولنے لگے۔ میں نے سانس روک لی۔ اگر بابو بھائی آہستہ سے یہ چاقو میرے سینے میں اتار

دے تو یہ راز کبھی کاغذ پر نہ اتر پائے گا۔ بابو بھائی نے بنا کھولے چاقو واپس جیب میں ڈال لیا۔

مجھے اپنے شک پر بے حد ندامت ہوئی۔

"یہ دھندا سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اپنے سیٹھ کے تو بنگلور، مدراس، دلّی، کلکتہ بلکہ سُنا ہے یورپ تک میں تخت ظرز ہیں۔ تقی بھائی کہہ رہے تھے باقاعدہ ان شیئرز کے نیلام ہوتے ہیں۔ دامادوں کو جہیز میں دیئے جاتے ہیں۔ جوئے میں ہارے جاتے ہیں۔

مجھے بوکھلایا ہوا دیکھ کے بولے۔

"سچ پوچھئے تو اس دھندے کے بغیر کام نہیں چلتا۔ بڑے بڑے سودے انہیں پارٹیوں کی مدد سے ہوتے ہیں۔ آج کل پارٹیوں میں رونق تب ہی ہوتی ہے اور جو سیٹھانیاں آتی ہیں۔ وہ ایک کونے میں جتھا باندھے کپڑا زیور کا ذکر خیر کرتی رہتی ہیں، بچوں کے کارناموں کا دکھڑا روتی ہیں ساتھ آئی کنواری بیٹیوں کی نگاہ بانی کرتی ہیں۔"

"وہ بھی پارٹیوں میں حصہ لیتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کنواری بالی بیٹیاں؟"

"نہیں صاحب وہ بڑی سنبھال کے رکھی جاتی ہیں۔"

"ان کا بازار الگ ہے" میرا جی جل رہا تھا۔

"جی، کیا بات کہہ دی آپ نے۔ ویسے بھاگ کے چلی جائے تو اور بات ہے ورنہ بڑی چھان بین کے بعد سودے ہوتے ہیں۔"

"جن کی داشتائیں منہوں بہت پلاتے پلاتے نہ ہوں۔"

"یعنی نیک نہاد داماد۔"

"نہیں جی، اگر موٹا آسامی ہو تو کڑوی باتوں کا سوال نہیں اٹھتا۔ کون نہیں جانتا کالجوں کی لڑکیاں کیا گل نہیں کھلاتیں۔"

"بس کالجوں کی لڑکیاں ہی گل کھلاتی ہیں۔ یہ جو پون پل اور فارس روڈ والیاں ہیں یہ تو کالج نہیں جاتیں؟"

"ارے صاحب میں یہ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ وہ اَن پڑھ ہوتی ہیں۔ بدصورت بھی ہوتی ہیں، گھروں سے بھاگ آتی ہیں۔ یا اغوا کرلی جاتی ہیں۔ بھگانے والے کوڑے کرکے چل دیتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں۔ اگر یہ گل نہ کھیلیں تو ہم جیسے چوری کریں یا بھیک مانگیں۔ کتنوں کو ان کی دولت وہ دقت روح کو شاد کرے دل کو جو پر نور کرے۔

ہر نظارے میں یہ تنویر کہاں ہوتی ہے کی روٹی ملتی ہے۔ تب ہی تو یہ دھندا دنیا سے کبھی نہیں مٹے گا۔"

"چین اور روس میں یہ دھندا نہیں ہوتا۔"

"مگر وہ تو لا مذہب ہیں شادی ہی نہیں کرتے!"

"کیا شادی گارنٹی ہے کہ دھندا نہیں ہوگا۔ ابھی آپ ہی بتا رہے تھے کہ...."

"بابولال جز بز ہو گیا۔ میں ڈری کہ اب بھاگا۔ میں نے جلدی سے بات پلٹی۔"

"مگر یہ ریڈ لائٹ ایریا۔ بڑی بے رحمی ہے یہ تو۔"

"جی جانور ذبح کرنا بھی کہہ دیجیے کہ بے رحمی ہے۔ مچھلی، مرغی"

"مگر انسان کا ذبیحہ کس مذہب میں واجب ہے؟"

"مذہب کو بیچ میں نہ لائیے۔" بابولال گرم ہونے لگے مگر بھاگے نہیں۔

"آپ پکے مسلمان ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"مذہبی تعلیم ممبئی میں آکر مکمل کی۔؟"

"نماز پابندی سے تو نہیں لیکن جب بھی موقع ملتا ہے۔ پڑھتا ہوں۔"

"باجماعت؟"

"جی ہاں۔ عشاء اور فجر کی قضا ہو جاتی ہے۔"

"قرآن؟"

"وہ حرام زادے تاڑ کے بچے نے مکتب سے اٹھا لیا۔ نماز تو ممبئی میں آکر سیکھ لی۔" اور پھر جماعت میں تو زیادہ پڑھنا نہیں پڑھتا۔ امام ہی پڑھتا ہے۔"

"جی ہاں پوچھ لوں پھر بندو بھائی ایسا ہی ہندو ہوگا" مگر ٹال جانا مناسب سمجھا۔

"حج کا ارادہ ہے۔" بڑی عقیدت سے بولے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر بولے "اب چلوں؟"

"بہت بہت شکریہ شکیل میاں۔ آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اگر میں خود جاؤں تب بھی اتنی باتیں نہیں ہو پائیں گی۔ فارس روڈ پر سے گزرنا بھی مشکل ہے۔ بجائے ان کے میرا سر جھک جاتا ہے کس نفرت سے مجھے دیکھتی ہیں۔ بھلا دل کی بات کیا کہیں گی۔ برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آنکھیں صرف جھک جاتی ہیں۔ بند نہیں ہو جاتیں۔"

"ارے آپ اتنی جذباتی ہو رہی ہیں۔ گھر میں غلاظت کی نالی ہو گی اندھیرا مچ جائے بھلا سوچئے۔
یہ جو لاکھوں مزدور اپنے گھر بار چھوڑ کر مزدوری کرنے آتے ہیں۔ بیوی بچوں کو ساتھ نہیں لاتے۔ کیا
ان کی انسانی ضروریات کا کوئی انتظام نہیں ہونا چاہئے۔"

"مگر اتنی غلاظت؟"

"غریب کا ہر موڑ پر غلاظت سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا گھر گندہ محلہ گندہ جن ہوٹلوں میں
کھانے کی قدرت ہے وہ گندے پانی گندہ، ہوا گندی، تو عورتیں کیا انہیں پیدر روڈ یا کلابہ کی ملیں گی؟"

میں چپ رہ گئی۔

"اگر یہ عورتیں نہ ہوں تو عورتوں کا رہنا چلنا پھر ناشکل ہو جائے۔ ویسے ہی یہ بھوک دن بدن
بڑھتی جا رہی ہے۔ پیٹ سے اتنا نہیں بچتا جو یہ ضرورت پوری کرنے پر خرچ کرسکیں اسی لئے
ریپ، بلات کار کی وبا پھیلتی جا رہی ہے۔"

"اس کا علاج؟"

"کچھ نہیں، قیامت کے آثار ہیں۔" بابو بھائی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"آپ میرے گھر چلیں گی؟"

"ضرور۔ کب؟"

"بس ابھی، آج مجھے فرصت بھی ہے۔ پلار صاحب کی ڈیوٹی پر ہوں۔"

"میری بیوی سمجھتی ہے، امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہوں۔ گاؤں میں بھی سب پر رعب، مزہ یہ
ہے کہ اس دھندے میں بھید کھلنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ بھیدی کے اپنے بھید بھی تو ہیں۔ جب برے

پاس کچھ پیسہ ہو گیا تو میں بڑے ٹھاٹ سے گاؤں گیا۔ رعب پڑ گیا۔ میرا تاؤ میرے آگے پیچھے دوڑنے لگا۔ پیغام آنے لگے۔ لڑکیاں دکھائی گئیں۔ مجھے رفیقہ پسند آئی۔ دو سال منگنی رہی۔ میں نے فلیٹ خریدا سجایا اور اُسے دھوم دھام سے بیاہ لایا۔ نویں جماعت میں تھی۔ میں نے سوچا میٹرک کرلے۔ گورکھ پور سے آئی ہوئی تھیں میری خالہ۔ آپ دیکھیے گا رفیقہ کو، لاجواب بیوی ثابت ہوئی۔"

"تم بھی تو لاجواب ہو شکیل میاں۔"

"بنائیے مت۔"

"میں بناوٹ کی قائل نہیں۔ تم اس غلاظت میں پل کر بھی اتنے اچھے انسان بن سکے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔"

"سب بندو بھائی اور تقی بھائی صاحب کی عنایت ہے۔ آپ سمجھتی ہیں۔ اس دھندے میں سب ہی کمینے ہیں۔ قسم سے اس دھندے میں سب سے کم بے ایمانی ہے۔ خوفِ خدا اسی دھندے میں رہ کر پروان چڑھتا ہے۔ ہر نماز میں خدائے ذوالجلال سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ میرے گناہ وہی بخشنے والا ہے۔ وہ ستار ہے اور رحمٰن بھی۔"

ہم بائیکلہ کی ایک کوٹھی کے تیسرے مالے پر پہنچے۔ دو بیڈ روم کا فلیٹ بالکل بائیکلہ کے معیار سے سجا ہوا۔ پلاسٹک کے پھول، ہاتھ کے کاڑھے کُشن، مکہ مدینہ کی تصویریں، کھریا مٹی کا تاج محل، پاکستانی سرامک کا گلدان، ودی فشل سلک کے پردے، ٹی۔ وی جس پر کڑھا ہوا غلاف ہاتھ کے بنے میز پوش، ایک شیلف میں شیشے کے کھلونے، چاندی کے کھلوتے ڈبیاں وغیرہ۔

رفیقہ سُرخ ٹشو کا کمونو پہنے جوڑا باندھتی نکلی۔ بھر بھر ہاتھ سونے کی چوڑیاں، ٹاپس اور گلے

میں چین، معصوم سی نمکین صورت بے حد باریک پنچی ہوئی بھوئیں۔ دھلا ہوا چہرہ۔ انگلش کے لفظ ملا ملا کر بڑے تیکھے انداز میں بول رہی تھی۔

"آیا، بے بی لوگ کا ٹفن لے جاؤ نا، تھرماس نہ بھولنا۔"

"آیئے اماں سے بھی مل لیجئے۔"

مجھ سے کچھ چھوٹی ہی ہوں گی عمر میں لیکن شکیل میاں کی اماں ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھیں۔

اماں، یہ آپا ہیں۔ تم سے ذکر کیا تھا نا"۔ شکیل میاں جھک کر بولے۔ شاید اونچا سنتی تھیں۔

"ہوں.... جیتی رہو۔ بیٹھو۔" انہوں نے خالی خالی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"اماں کو دکھائی نہیں دیتا۔ بہت علاج کروایا کوئی فائدہ نہیں۔ انشاء اللہ حج کو گئے تو ادھر ولایت بھی لے جائیں گے"۔ رفیقہ بولیں۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو آنکھیں بینائی سے محروم ہیں وہ کون سی بینا ہیں"۔ میں نے سوچا۔

⁂

اسرار الحق مجاز

ایک نُچی کُھچی شام تھی۔ لڑکیاں موسمی چھٹیاں گزارنے اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکی تھیں۔ صرف چند پھوٹے نصیبوں والی جن کے گھر دور تھے یا کوئی ہم سفر نہ ملا تھا۔ ڈھنڈار ہوسٹل میں سہمی ہوئی ابابیلوں کی طرح سرگرداں نظر آجاتی تھیں۔ لوگ سمجھتے ہیں یہ کالجوں کی آلڑو لڑکیاں بس دن رات عیش ہی کیا کرتی ہیں۔ کوئی انہیں کیسے بتائے کہ کالج کی حقیقی عیاشی اسی زمانہ میں ہوتی ہے جب کہ پڑھائی ہو رہی ہو۔ ورنہ بے مصرف گزرنے والی چھٹیوں میں تو بورڈنگ میں بس پاگل خانے کا لطف آجاتا ہے۔

جب بدگوئیاں کرتے کرتے جبڑے دکھنے لگتے، اور ساری کہانیاں اور چٹکلے پھیکے پڑ جاتے اور سارے سیاہ اور سفید جھوٹ شائع ہو چکتے۔ کرچی متلانے لگتا تو سہلائے ہاتھی ڈیاد چاردیواری

سے سر پھوڑنے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ دن تو کسی نہ کسی طرح زبردستی ہنسی کھیل میں گھسیٹ ڈالتے پر جوں ہی شام کا سرمئی سایہ صحن میں رینگنا شروع کرتا دم بولا اٹھتے اور نامعلوم سا دھیما دھیما خوف گلا دبوچنے لگتا۔ چپکے چپکے گنتی کی آٹھ دس لڑکیاں ایک دوسرے کے قریب کھسک آتیں، گھروں کی یاد دل میں سلگ اٹھتی اور بے اختیار سر جوڑ کر آنسو بہانے شروع کر دیئے جاتے۔ آنسو پونچھے جاتے اور پھر گھل مل کر جینے کی کوشش شروع ہو جاتی۔

جوں ہی شام پڑی سب کی سب کامن روم کی لمبی چوڑی دری گھسیٹ ٹینس کورٹ پر لے آئیں اور تکیے چادریں لگا کر ایک عام خواب گاہ تیار ہو گئی، اور شروع ہو گئی گپ بازی۔

گھر نہ جا سکے تو کیا، ذکر ہی سے منہ میٹھا کرنے لگے۔ پر جوں جوں گھروں کی باتیں ہوئیں جی اور زیادہ بوجھل اور اداس ہوتے گئے، یہاں تک کہ گلے رندھ گئے اور خیالات کی ڈوریاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ سب ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

اور میں سوچ رہی تھی یہ چاندنی کس قدر مردہ ہے۔ یہ سائے صحن کے کونوں میں کتنے خاموش دبکے بیٹھے ہیں۔ جو یہ ایک دم سے جھپٹ پڑیں تو؟ اور یہ غیر مرئی پرچھائیاں سی جو دماغ میں سرسرا رہی ہیں۔ یہ اداسی کتنی بوجھل ہے۔ آلو کی آواز میں کیسی سنگدلی پوشیدہ ہے اور یہ ٹینس کورٹ پر لمبی لمبی لیٹی ہوئی لڑکیاں بالکل غمگین قبروں کی طرح معلوم ہو رہی ہیں۔ میں ایک بڑے سے بھیانک تابوت میں گھٹی ہوئی ہوں۔۔۔ آہ اماں نے مجھے گھر کیوں نہیں بلایا۔ انہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں، تو کسی کو بھی مجھ سے محبت نہیں۔ اور کسی کو نہیں معلوم کہ میں کتنی اکیلی ہوں؟

اور سب لڑکیاں بھی یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ چار دن چھٹیوں کے گزر گئے۔ چار اور گزر جائیں گے پھر چار دن اور رہ جائیں گے اور یوں ہی یہ لمبے بے کار بے رنگ دن اور یہ تھکی تھکی شامیں یہ اتھک رینگتی ہوئی قطار! توبہ۔ ناامیدی اور غریب الوطنی کے احساس نے کچھ اس درجہ مجبور کیا کہ بے اختیار آہیں نکل گئیں۔

"اب کے گرمیوں میں ماموں ابا کے پاس چلی جاؤں گی" اختر نے ترکیب سوچی۔

"اور ہم پہاڑ پر جایا ہی کرتے ہیں" رضیہ نے اطلاع دی۔

"کلیان بڑی اچھی جگہ ہے"۔ عالیہ ہمیشہ اڑتی تھی۔

مگر محمودہ؟ کالی آنکھوں، کالے بالوں اور کالی رنگت والی محمودہ؟ اس کا کیا ہوگا۔ جس کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ رشتہ دار، بورڈنگ ہی اس کا گھر تھا، وہی لمبا چوڑا مقبرے کی طرح سنسان ہوسٹل، جہاں وہ چھٹیاں گزارا کرتی تھی۔ پھر گھٹن اور بڑھ گئی۔ ایک خلاسی دلوں میں پھیلنے لگی۔ اسی خلا میں آواز آئی۔

"اے غم دل کیا کروں۔۔۔ ؟"

چونک کر جو ہم نے دیکھا تو یہ چاکلٹ جیسی سوندھی رنگت والی محمودہ تھی جو ہم سب سے دور دری کے کونے پر ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھے اپنی آنسو بھری آواز میں گنگنا رہی تھی۔

"۔۔۔ اے وحشتِ دل کیا کروں ؟"

یہ رو پہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال

جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا جال

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

کچھ سوتی ہوئی لڑکیوں کے سپنے بکھر گئے۔ کلبلا کر اُٹھ بیٹھیں۔ محمودہ کی آواز جذبات کی فراوانی سے اور سہم گئی ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنیئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر تو سارے ٹوٹنے لگے، موتیوں کی لڑیاں ہنسیں سے بکھر کر دوپٹوں میں اُلجھ گئیں سینوں میں ہوکیں اُٹھنے لگیں۔ لیکن جب شعلے بھڑک اُٹھے پیمانے چھلک پڑے اور سینوں کے زخم مہک اُٹھے تو ڈرامہ شاعری کی حدوں سے گزر کر بھونڈے قسم کی بھوں بھوں میں پھسل آیا۔ وہ دھوم دھام کی صفِ ماتم بچھی کہ محرم ماند پڑ گئے۔ سروں سے گزر کر ہلڑبازی پر نوبت پہنچی۔ نہایت غیر شاعرانہ قسم کی ناک کی سوں سوں۔

از حد عامیانہ اور بھکائی لُسّر لُسّر، لاحول ولا قوۃ!

ایک ہنسی! پھر دوسری! اور سب کھل کھل کر لوٹ گئیں۔

توبہ! مگر غصّہ تو محمودہ چڑیل پر آیا اور اصل غصّہ آیا اس چھوٹی

سی کتاب پر جسے وہ آڑ میں چھپائے ہوئے تھی۔ چھاپہ مار کر کتاب کو قبضہ میں کرنا چاہا۔

"لو بھئی صفیہ اپنی کتاب۔" اس نے کتاب صفیہ پر کھینچ ماری، ایک کتاب کی دس بنتے بنتے رہ گئیں۔ جلدی جلدی لالٹین کی روشنی میں شاعر کا نام دیکھا۔

"ہائے قے!" نفیس ناک والی انور بولی۔ "اسرار الحق!"

"چہ توبہ کس قدر ڈھیل نام ہے۔"

"مگر مجاز!.... ٹھیک ہی ہے۔"

"خاصہ ہے"

"چہ حد.... کافی سوٹ ہے جی!"

تو یہ تھی وہ کتاب جس کا نام تھا "آہنگ" جس نے ہمیں ایسے بڑے موقعہ پر پکڑ کر اتو بنا دیا.... بڑا جی کھسیانا ہوا۔ اور پھر لالٹینوں کی بتیاں اکسا اکسا کر وہ وہ غم دل کی پوچھ گچھ کی گئی کہ توبہ بھلی! پتلی سی کتاب ایک روپیہ قیمت وعیدی، بقرعیدی، نمائش کے پیسوں سے چھ چھ، سات سات کاپیاں خرید ڈالیں۔ تحفے ہیں تو "آہنگ" نقد ادھار عاریتاً غرض سارے بورڈنگ میں "آہنگ" چل پڑی۔ جدھر دیکھئے چار لڑکیاں چمن کے کونے میں سر جوڑے کبھی "اندھیری رات کے مسافر" کے ساتھ دشت پیمائی کر رہی ہیں تو کبھی بربط شکستہ کے تار سلجھائے جا رہے ہیں۔ دو "تنہا دل" لئے بیٹھی ہیں۔ تو چار "خانہ بدوش" کے ساتھ چند "رات اور ریل" کے ساتھ فراٹے بھر رہی ہیں تو کوئی بھولی بھٹکی غمگین "کسی کی یاد میں" عزق منہ اوندھائے پڑی ہے۔ کسی طرف "انقلاب"

لایا جارہا ہے تو کہیں "غدار" پر پھٹکاریں پڑ رہی ہیں غرض دل و دماغ پر کچھ اس تان سے "آہنگ" چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی وبا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے۔ یہاں تک کہ کان پک گئے سنتے سنتے جی متلا اُٹھے۔

"چہ توبہ ہے، تم تو مر جاؤ اس پر جاکر"

"پڑھنا وڑھنا چھوڑ و جی، اس کے در پہ دھرنا دیدو جا کے۔"

"صفیہ سے کہو تمہاری شادی کرادے"!

"واہ تم نہ کر لو شادی"

کڑوے کڑوے جملے چلتے۔ جی جل جاتے، اور منہ، سوج جاتے۔

"یہ سب جنسی بھوک ہے۔ جہاں لڑکے کا نام سنا مر مٹیں"

ناک پر عینک لگائے ٹیچر س بڑبڑائیں۔ ذہنی غلاظت۔

یہ لیجیے مذاق ختم، جرم ثابت، مجرم سہم کر رہ گئے۔ ہونٹ ساکت ہوگئے مگر دل لرزاں۔ یہاں کم بخت شاعر سے جان نہ پہچان، سر دکار ہی کب تھا شاعری سے جو رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ وہ قائم رہا طعنوں تشنوں کی سنگ باری نہ توڑ سکی۔

اور جب اسی قسم کی اُداس تنہائیاں بورڈنگ کی فضا کو گھیر لیتیں تو پھر غم دل اُبھر آتا۔ محمودہ کی لرزتی ہوئی آواز ہوتی اور چمن کے خاموش کونے، ایک دوسرے کے شانوں پر سر ٹک جاتے اور آنسوؤں کے بند کھل جاتے۔ یہی معلوم ہوتا کہ شعروں میں اپنا ہی دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ وہی جانے پہچانے دُکھ وہی پرانی آشنا اُلجھنیں۔ سب ہی کچھ تو تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اختر شیرانی کی سہیلی سلمیٰ کی عمر کچھ ڈھل چکی تھی۔ حفیظ کچھ شاہی قسم کی شاعری پر تلے ہوئے تھے۔ جگر مرنے کی بات کہتے تھے مگر کچھ پرانی وضع میں۔ رہ گئے جوش تو ان کی شاعری سے محظوظ ہونے سے زیادہ خوف آتا تھا۔ وہ ان کے دبنگ الفاظ دبنگ خیالات۔ اور کچھ نادر شاہی قسم کے احکامات سن کر کچھ ہیبت بھی زیادہ طاری ہو جاتی تھی۔ مگر مجاز سے کچھ رشتہ داری سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے ایک ہی قبیلے کے ہوں، بلکہ ایک ہی خاندان کے۔

پر نہ جانے کس کی نظر لگی کہ ڈوری کچھ ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی۔ سنا مجاز ریڈیو میں نوکر ہو گئے اور علی گڈھ بھر کی لڑکیوں کو سمیٹ سمیٹ کر تقریریں کروانے لے جایا کرتے ہیں۔

اور پھر سنا، نکال دیئے گئے ریڈیو اسٹیشن سے!

پھر سنا، کچھ نہیں کرتے۔

پھر سنا کچھ بھی نہیں کرتے۔

اور پھر سنا اجی کچھ بھی تو نہیں کرتے!!!

نکٹو!

جو کہیں نوکر نہ ہو یعنی مہینہ کے آخر میں مقررہ رقم بطور تنخواہ نہ لاتا ہو، اسے عرفِ عام میں نکھٹو کہتے ہیں۔ جی ہاں، آپ نے دیکھے ہیں یہ نکھٹو؟

ہندوستان کے ہر متوسط طبقہ کے گھر کو جملہ خاندانی امراض مثلاً دمہ، دق، گٹھیا وغیرہ کی طرح یہ بھی لاحق ہو جاتے ہیں اور ہر جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد ان کی تعداد

میں شدت سے اضافہ ہو جاتا۔ خدا جانے لفظ نکھٹو کو دیکھ کر مجھے میاں مٹھو کیوں یاد آجاتے ہیں۔ جنہیں شوقین طبع لوگ پنجروں میں بٹھا کر ان سے کہتے ہیں میاں مٹھو "نبی جی بھیجو" اور میاں مٹھو گول گول آنکھیں گھما کر چونچ اوپر نیچے مٹکا کر فی البدیہہ نبی جی بھیج دیتے ہیں۔ مگر بعض کچھ ایسے کوڑھ مغز ہوتے ہیں کہ ہزار بھیجا مار دنبی جی بھیج کر نہیں دیتے۔ یہ نکھٹو کی صف میں آتے ہیں، آپ ان کے ساتھ خواہ کتنا بھی ریاض کیجئے۔ کام نہ چلے گا۔ بہت کیا اور کلرکی وغیرہ کے اڈے پر ٹالکا دیئے گئے۔ تو "میاں مٹھو" کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

اُف یہ لاچار پر مدے، کاش کوئی ان کے پنجروں کی سلاخیں پگھلا دے اور ان سکڑے ہوئے بازوؤں کو ایک بار اپنی اڑان دکھانے دے مگر دیکھ کر، فضا میں لاکھوں شکرے اور باز منڈلا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی جھپٹے میں معاملہ صاف!

سب سے پہلے تو یہ ادبی شکرے ہیں۔ اگر چڑیا پھنس گئی تو اتنی ایڈیٹری کروائیں گے کہ قلم کی نوک کے ساتھ ساتھ انگلیوں کے پورے بھی گھس جائیں گے۔ اور اتنا کوڑا کھوائیں گے کہ کفن دفن کی ضرورت نہ رہے گی۔ اسی میں مغفرت ہو جائے گی۔

دوسرے ریڈیائی باز ہیں اگر ان کے ہتھے چڑھو تو وہی گت ہو گی۔ جو قلندر کے ہاتھ میں بندر کی۔ وہ ادنگھے بونگے ناچ ناچنا پڑیں گے کہ خدا کی پناہ ڈرامہ، ڈرامچہ، افسانہ، افسانچہ، نظم اور نظمیے اتنے لکھوائیں گے کہ انسان ایک دن خود ایک مستقل "چہ" بن کر رہ جائے گا۔ وہ سارے ملک میں انقلاب وارد کرنے کے دعوے، وہ خون کے طوفان

اٹھلانے کے اور سرخ آندھیاں چلانے کے رنگین ارادے، ڈرامچوں کی موٹی باریک آوازوں میں ڈوب جائیں گے۔ اور تھوڑے دن بعد کام کی غیر دلچسپ نوعیت اور یکسانیت سے بدحواس ہو کر گھر سے لے کر اسٹوڈیو تک کے راستے کے علاوہ سب کچھ فراموش ہو جائے گا۔ وائے بر قسمت ادب اور آرٹ!

اگر غلطی سے کبھی اس پنجرے کی کھڑکی ڈھیلی پڑ گئی اور قلانچ لگائی تو نیچے فلمی خندق موجود ہے۔ یہاں پہنچ کر اپنی رہی سہی انقلابیت بوند بوند کر کے ٹپک جائے گی۔ اور جو چھوک رہ جائے گا اسے کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔

لیکن جب مجازؔ ریڈیو سے نکلے تو انہیں کچھ عجیب قسم کی چیلیں جھپٹ لے گئیں۔ ایک طبقہ ہے۔ ہندوستان میں جو صرف کھانے اور پینے کی اہم خدمات انجام دیا کرتا ہے۔ عرف عام میں اس طبقہ کو کھاتا پیتا طبقہ کہتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے منچلے بھرے پڑے ہیں۔ اس طبقے کے تنے گمان نے باپ دادا کے آبائی پیشہ رنڈی بازی سے اکتا کر علم وادب سے لطف لینا شروع کر دیا ہے۔ اب ان کی محفل میں بجائے منی جان کے ادیب اور شاعر پالے جاتے ہیں۔

خدا جانے مجازؔ کس رشتہ سے پھنسے اور کس خوفناک بھٹکی میں پر اڑائے کہ پیتے جی مردوں۔۔۔۔ میں گن لئے گئے، وہاں خدا جانے کیا کھایا اور کیا پیا کہ اذگھ ہی تو گئے۔

مجازؔ کچھ نازک قسم کے پودے کی طرح ہیں، کہ کھلے باغ میں تازی ہوا صاف پانی ملے تو بہار ہی بہار! اور جو حماقت سے تھوہڑ اور بھٹ کٹی کے بیچ میں دامن الجھ جائیں تو سوکھ

ساکھ کرٹھونٹھ۔

اور پھر ساکر مجاز کے دماغ میں کچھ کیڑے رینگنے لگتے ہیں۔ پھر وہ کیڑے بڑھ کر مگرمچھ بن گئے اور ماشاء اللہ اسے مالیخولیا کے ابتدائی درجہ میں قدم رکھ دیا۔

اور پھر یہ سنا کہ خدا کے فضل سے ہو گئے پورے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُنھ! چلو چھٹی ہوئی۔ پاپ کٹا۔ ماں باپ کو بھی ذرا سکون ملا ہوگا۔ غریب دن رات ہول میں جیتے ہوں گے۔ ادھر ہر دانی ہے کہ نہ جانے کون "غنڈوں" کے ساتھ مل کر ادھم مچا رہا ہے۔ ادھر اس نے لاوا اُگلنا شروع کر دیا تھا، سو تو خیر سے وقت پر ہی منہ پاٹ دیا گیا۔

جب چراغ میں تیل نہیں رہتا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور جب شاعر یا ادیب گنگ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو فی الحال مجاز بھی چل بسے!

"غمِ دل" رو پڑا۔ دل کی وحشتیں کھسیا گئیں۔ "طفلی کے خواب" سائے بن کر دھندلے ہوئے اور پھر مٹ گئے۔ آہنگ کی دو چار کاپیاں اِدھر اُدھر رلیں۔ میلی ہوئیں پھر کھو گئیں۔ کون ڈھونڈے، اونہہ۔

اور اس پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔

خاک اور دھول کی دنیا میں ایک پھول نے اپنا مغرور سر بلند کیا تو چمن مہک اٹھا۔ دیوتاؤں نے آسمان سے جھک کر اسے دیکھا اور اسے چن کر اپنے عظیم الشان باغ میں سجا دیا۔ ادھر سے آئی میٹھی میٹھی آنکھوں والی پریوں کی شہزادی۔

"اے پھول تم کتنے حسین ہو" اس نے کہا اور پھول پنکھڑیاں پھیلا کر غبارہ بن گیا۔

"تو مجھے اپنے بالوں میں لگا لو نا" پھول نے کہا۔

"نہیں میرے حسین پھول تم اسی طرح مہکتے جاؤ اور میں تمہیں دیکھ کر آہیں بھرتی رہوں گی۔"
ننھی شہزادی نے اپنی میٹھی آنکھوں میں آنسو چھلکائے۔

"دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں" پھول نے بازو پھیلا دیئے۔

"شاعرانہ دل اور آنکھیں سمیٹ لو۔ میرے قدم تو اطلس و کمخواب کے عادی ہیں اور میرے جوڑے میں لگانے کے لئے سونے کا پھول موجود ہے۔"

پھول کی ساری التجائیں بے کار گئیں۔

شہزادی کے جوڑے میں سونے کا پھول سورج جیسی آب و تاب سے جگمگاتا رہا۔ جس کی تمازت سے اس بے چارے خاکی پھول کی ساری پنکھڑیاں ایک ایک کر کے مرجھاتی گئیں اور پھر ٹہنی ٹھنڈ رہ گیا۔

جب دیوتا نے پھول کی اس بدمذاقی کو دیکھا تو بُرا مان گئے وہ اسے لائے تھے کھلنے اور مہکنے کے لئے نہ یوں نخرے دکھانے کے لئے۔ اکتا کر وہ اسے واپس اُجڑی ہوئی دھرتی کی گود میں ڈال گئے۔

کہانی ختم!

پر کون جانے اسی ننھی منی کہانی میں مجاز پر کیا کچھ بیتی۔ پر تیز نگاہ سے کیا کچھ پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ مجاز کا راز کوئی ڈھکا چھپا نہیں۔ اس کے زمانہ کے ہر نوجوان کی زندگی کے آئینہ میں جھانکیئے اور مجاز کو دیکھ لیجئے اس کے ہر دکھ میں مجاز کے دکھ کا راز مل جائے گا۔

پھر بھی خود مجازؔ نے جو دیکھا وہ "ارباب نشاط میں دکھا بھی دیا۔"

بن گیا تھا ایک بیک فردوسِ کیف و انبساط
ایک دیرینہ کرم فرما کا ایوانِ نشاط

اور وہاں جب

"نرم صوفے گودمیں فردوس رعنائی سے لئے نظر آئے تو بے اختیار شاعر پر اپنی زندگی کا صحیح مصرف واضح ہو گیا۔ اور اس نے سوچا چلو اور کچھ نہیں پھر بھی اتنا تو سہارا ملا کہ.....

میرا نغمہ باعث دلداریٔ خوباں تو ہے
میرا اردنا خیر سے وجہ نشاط جاں تو ہے

اور اس سے زیادہ کی ہوس بھی بے کار، ویسے داد بھی ملی اور بے داد بھی مگر نہ اتنی جتنی آس باندھی تھی۔ محفل خوباں میں شاعر کو تو جی بھر کے داد ملی، پر وہ ناکارہ انسان جو اس کی پشت کے پیچھے چھپا ساتھ چلا آرہا تھا۔ خالی ہاتھ ٹرخا دیا گیا۔ شاعر نے "واہ" کی آرزو کی وہ مل گئی۔ انسان نے "آہ" کی تمنا کی وہ نہ ملی۔

اور جب انسان کی ہار ہوئی تو شاعر بھی کھسیا کر رو پڑا۔

مجازؔ کی زندگی کی طرح ان کی صورت شکل بھی اُلجھی اُلجھی سی ہے۔ لفظوں میں نقش و نگار کو ڈھالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہوا میں دائرے کھینچنے کی کوشش کرنا۔ تاثرات کی چہرے پر وہ بھا بھی ہے کہ نقش و نگار کچھ سے کچھ بن کر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں تو ہیں مگر یہ اندازہ لگانا از حد مشکل ہے کہ ان کی تہہ میں کیا ڈوبا ہوا ہے ایک مبہم سی یاس و ناامیدی

مگر ساتھ ساتھ کچھ بنانے کا ارمان، کچھ ڈھانے کا حوصلہ، کچھ اُلجھنیں اور پریشانیاں جو آجکل کے ہر نوجوان کا آبائی حق بن کر چمٹ گئی ہیں۔

اور ایک ناک جو ستواں کی حدوں سے کب کی گزر چکی ہے۔ جس کی ہڈی شاید بڑھ رہی ہے اور چمڑہ چھوٹا پڑتا جا رہا ہے اور نہایت ڈرپوک قسم کا سہما ہوا دہانہ جو اپنے مالک کے سریع الحس اور جذباتی ہونے کا علمبردار ہے۔ مجاز عجب قسم کا بزدل ہے۔ ویسے تو قلم کے بل بوتے پر وہ خون کی آندھیاں چلوا سکتا ہے۔ سرخ طوفان لا سکتا ہے لیکن اگر آپ اس کے سامنے ایک منّی سی چوہیا کی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر کھردری سڑک پر گھسیٹیں تو وہ رو پڑے گا۔ پچھلے دنوں جب ملک کی چیر پھاڑ کا جشن بڑی دھوم دھام سے سارے ملک میں منایا جانے لگا اور جیتے جیتے خون کی ہولی کھیلی گئی تو وہ دماغی طور پر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ دنیا کو ایک رشتہ میں بندھا ہوا دیکھنے کی آرزومند آنکھوں نے جب انسانی کھوپڑیاں سڑک پر پتھروں سے ناریل کی طرح پھوٹتی دیکھیں تو اس کی روح تک لرز اُٹھی۔ وہ کئی گھنٹے بیہوش رہا اور دونوں منہ میں نوالہ نہ ڈال سکا۔

ناک نقشہ کے حساب سے ہاتھ پیر بھی ہیں۔ پربال جی بھر کے ملے ہیں۔ جن کے ایک کنارے پر کسی زمانے میں سفید کھدر کی ایک ٹوپی اس طرح معلق رہا کرتی تھی کہ ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب گری ا اور اب گری۔ اور شاید غریب کہیں گر ہی پڑی اور ہمالیہ سے نکلنے والے "سرکش دھارے" کی لپیٹ میں آکر بہہ گئی اور اس کی جگہ بالوں والی چائے پوشی سے ملتی جلتی کیپ نے لے لی۔ لیکن وہ بھی کہیں لال پیلی آندھیاں اُڑا لے

گئیں اور آج کل جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں مجاز کے سر پر کوئی شے نہیں سوار ہے۔

ویسے میں مجاز کو بہت کم جانتی ہوں، میرا مطلب ہے میں اصل مجاز سے زیادہ انہیں ان کی شاعری میں ڈھونڈ کر پاتی رہی ہوں، بات یہ ہے کہ پہلے میری ملاقات ان کی شاعری سے ہوئی۔ اور پھر جب میں خود شاعر سے ملی تو میں نے انہیں وہی سمجھا جو اشعار نے بتایا تھا۔ میں نے مجاز کی شخصیت میں بھی اپنے زمانے کے تمام مجاز ہی دیکھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مجاز تنہا نہیں وہ اپنے وقت کے سارے دکھوں، الجھنوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے خلاف پکارتا ہوا اٹھا، اور خوب اٹھا۔ پر نہ جانے منہ کے بل کیوں آرہا ہے۔

جھوٹ سچ کا عذاب رادی کی گردن پر مگر سنتے ہیں کہ اڑان کے زمانہ میں کہیں ایسے بے موقعہ پھیل پڑے تھے کہ توبہ بھلی۔ یعنی کہیں بالکل شجر ممنوع قسم کی محبوبہ پر پھیل پڑے جو اپنی آبائی مجبوریوں کی باعث عشق کے میدان میں تو اتر آئی مگر بزنس کے معاملے میں رہ گئی۔

اور بھئی سچی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے، پر قاضی اندھے نہیں ہوتے۔ خیر تو نہ جانے کیا بیتی۔ چہرے کی بجھی بجھی سی چنگاری بتاتی ہے کہ مزے کی نہیں بیتی۔ چہ یہ نوجوان! ویسے تو آسمان سے ستارے نوچ لائیں گے، اجی ایک نہیں "سارے کے سارے" تختِ سلطان تو کیا سارا قصرِ سلطان پھونک دینے کی دھمکی دیں گے۔ یعنی کہ پورے تیس مار خاں، لیکن جو ذرا میدان عشق میں تنکا بھی لگ گیا تو چت، فوراً لمبے لیٹ جائیں گے۔ اور کریں گے بھی کیا بے چارے صدیوں کی روائتیں اور فسانے یہی تو سکھاتے

ہیں کہ دنیا میں عشق کے سوا اور سب فضول ہے، زندگی کا پہلا اور آخری مقصد یہی تو ہے کہ جھٹ پٹ موقع بے موقع کسی کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ۔ اگر کامیاب ہو گئے تو سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھو، پھر بھوکوں ننگوں کی تعداد بڑھانے پر ٹوٹ پڑو۔ اگر ناکام رہے تو پھر کیا فکر ہے۔ پاگل ہو جاؤ۔ مزے سے برسوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔

خیر جی کون کہتا ہے عشق نہ کرو۔ جوانی اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے مگر آجکل کے نوجوان تو عشق بھی سلیقہ سے کرنا نہیں جانتے، پہلے زمانہ میں تو لوگ عشق کیا کرتے تھے اور بس کئے چلے جاتے تھے۔ پر آجکل کے عاشق کچھ عجیب قسم کی معجون ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ مرض عشق ہی میں مبتلا ہیں یا اور ہزاروں روگ ہیں جنہیں عشق کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔ اور مجاز جو کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہندوستان کے اس درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں کے نمائندے ہیں۔ جو زندگی کے سارے جھمیلوں بندشوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی جی توڑ کر ان سے کشتم کشتا کر رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہ کانٹے چبھتے ہیں اور ان کی نوک پر وہ اپنا سینہ ٹیک دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے یہ لوگ کیا جانیں سلیقہ سے عشق کرنا۔ کون جانے وہ عشق ہی تھا یا دنیاوی ڈھکوسلوں کے خلاف جہاد جو مجاز کے دل میں شعلہ بن کر بھڑکا۔ ہوش آتے ہی مورچہ بندی شروع ہو گئی ہو گی۔ پہلی جنگ تو خود اپنے گھر کی گورنمنٹ سے۔ خود اپنے جائز حقوق کے لئے بھی بہنوں کو لڑ لڑا کر سکول بھجوانا۔ ان کی شادیاں، کیوں اور کیسے ہوتی ہیں۔ اس کا سوچ بچار کرنا۔ اگر اس ادنیٰ سے مجاز پر پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ سمجھئے کہ آنے والی ساری فتوحات بھیانک شکستیں ہی نظر آئیں گی۔ بھلا

جب اپنے ہی گھر میں جالے تنے ہوئے ہیں تو دوسروں کے گھر میں کس منہ سے جھاڑ دے کر جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے مجاز کے والدین ان گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو منہ کا نوالہ روک کر بچوں کو تعلیم دلا دیتے ہیں۔

دوسرا محاذ کالج اور یونیورسٹی کے قوانین کے خلاف قائم ہوتا ہے۔ جہاں آج جرمانہ تو کل رسٹیکیشن پر نوبت پہنچی ہوئی ہے۔ چال ڈھال پر بندش، بول چال پر بندش، کھانے پینے پر بندش، غرض ایک سرے سے جینے پر بندش! اور جب زندگی میں یوں چاروں طرف سے ٹانگ کھینچی جا رہی ہو تو کوئی کیا تو عشق کرے اور کیا عاشقانہ شاعری، وہ زمانے تو لد گئے۔ جب شاعر مرے سے عشق کرتے تھے، اور شاعری کرتے تھے، اداب تو عشق کی گردن میں پولیس کا ڈنڈا لٹکا ہے، ہاتھ روٹی کمانے میں الجھے ہوئے ہیں، پیر غلامی کی زنجیروں میں گھسٹ رہے ہیں۔ ایک نہیں سو ہزار آسیب جان کو چمٹے ہوئے ہیں۔ اور حساس طبیعت ناک پر مکھی بٹھانے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں شاعری بجائے داستان حسن و عشق کے اگر معجون مرکب نہ بن جائے تو اور کیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے یہاں عشق و سیاست باہم سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھلا زندگی میں جب اتنی "مجبوریاں" ہوں تو کیونکر جیئے۔ ایسی صورت میں

"کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے"

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا بھلے ہی دن نہ تھے؟

ساز چھوڑنے پر کون تیار ہے وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہ

"لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری عادت نہیں"

پھر یہی مجبوریاں اور لاچاریاں ضدیں بن گئیں۔ چار دن کی ریڈیو کی نوکری ختم ہو گئی منہ پر تمانچہ سا لگا۔

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر اپنی گلی گڑھ کی ہزاروں محفلیں!

اور اب کہ

"آہ تیرے میکدے سے بے پیئے جاتا ہوں میں"

مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے۔

"پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں"

ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے۔

"سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا"

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجاز کو واقعی سیدھا سادھا عشق ہی ہوا تھا۔ یا یہ بھی اس کا وہی خواب تھا جو آج کل کا بیشتر نوجوان سوتے جاگتے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ پر تعبیر نہیں ملتی۔ وہ گھر میں گوشت و پوست کی چاند سی دلہن ہی لانا چاہتا ہے۔ یا دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی سے ڈھالنے کی خواہش کو دلہن کا روپ دے دیا ہے۔ اس کا عشق تو کچھ اس بری طرح اس دنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے کہ وہ اسے جدا ہی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی گھر بھی چاند سی دلہن کے پُرنور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں

ہو سکتا۔ جب تک ملک پرست یہ بھیانک یوگی نہ ہٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخساروں کی تابانیوں کے نغمہ بھی گاتا ہے اور ان گھنگھور گھٹاؤں کا نوحہ بھی کرتا ہے جو اس کے رخِ روشن پر چھائی ہوئی ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ چاروں طرف ٹھکے ہوئے وزنی تالے اس کی سانس گھونٹے دیتے ہیں۔ دانت پیس پیس کر وہ ان پر ہتھوڑے مارتا ہے۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی واضح اور اُبھری ہوئی نہیں ہے۔ محبوب اور عورت کا تصور بے حد انوکھا اور اصول شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا۔ اس لئے اپنے چند مخصوص حربے ہوتے تھے اور چند انداز جو وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا۔ مگر اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے۔ جسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے۔ اور پھر میں سوچتی ہوں کہ بھئی یہ شاعر تو بڑے ترقی پسند ہوں گے۔ مگر بے چارے شہنشاہ کے خوف سے کچھ نہ کہہ پاتے ہوں گے پر دل کی بھڑاس نکالنے کو معشوقاؤں کی آڑ میں سب کچھ کہہ گئے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز وہ شاعر ہے۔ جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

"میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے"۔ اس دنیا کی عورت یہی جسے آپ چلتا پھرتا روز دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں مجاز نے عورت کو پہلی بار عورت نہیں کہا بلکہ

اسے نکتہ داں بھی بنا دیا۔ حسن کے ساتھ ساتھ۔

مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

اور بجائے خون دل پلانے اور لختِ جگر کھلانے کے اچھی خاصی آدمیت کی باتیں کرتی ہے اور.....

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں

لیکن یہ کیلکہ

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں میرے اشعار میں جولانیاں اس کی

لاحول ولا قوۃ! کہیں یہ سب کچھ مجاز کے شاعرانہ دماغ کا واہمہ تو نہیں اور یہ جیتی جاگتی عورت جسے میں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں، کہیں اس کی یہ تمنا تو نہیں جسے وجود میں لانے کی آرزو میں یہ ساری جستجو ہے۔ جس کے بغیر خود اس کا وجود ادھورا اور حیران ہے۔ جس کے انتظار میں وہ اور اس کا وطن غلامی کی بیڑیاں پہنے گھل رہے ہیں۔ جسے وہ چیخ چیخ کر پکار رہا ہے کہ

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مگر جی نہیں مانتا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے تخیل سے کہہ رہا ہے "نوجوان خاتون" ہیولی نہیں۔

عورت ہے۔ جو شمع حرم یا گھر کی رونق ہی نہیں بلکہ ایک ساتھی ہے۔ جو زندگی کی دوڑ میں کندھوں پر سوار نہیں بلکہ نصف بوجھ کاندھوں پر لئے قدم بہ قدم ساتھ ہے۔ جس کا مقصد زندگی .... حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا" نہیں ہے۔

عام یقین ہے کہ اگر عورت گھر سے نکل کر کام کاج شروع کر دے تو اس کی نسائیت اور حسن مارا جاتا ہے۔ وہ بالکل کاروباری اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے اس میں وہ نسوانیت اور لطافت نہیں رہتی۔ مجاز کی رائے میں حسین شے خواہ باہر رکھو خواہ اندر حسین ہی رہے گی۔ بات یہ ہے کہ مجاز نے ایسی مثال بھی دیکھی ہے جہاں عورتیں تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ دنیا کے کاموں میں حصہ بھی لے رہی ہیں اور نسائیت سے بھی محروم نہیں ہوئیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں جو تعلیم کا اثر ہوا تھا وہ بہت کچھ اس مغالطہ میں ڈالنے والا تھا۔ جب عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا اور رنڈی کا پیشہ اختیار کرنا ایک ہی درجہ کا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں جو لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ اپنے آپ کو نہایت پاکباز اور مقدس ظاہر کرنے کے لئے بالکل ننوں کی سی زندگی گزارتی تھیں۔ لیکن اب جبکہ تعلیم نسواں کا مسئلہ حل ہی ہو چکا اور لڑکیاں آزادی سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ بالکل غیر دلچسپ اور مردہ دل نہیں ہوتیں، اور نہ ہی ان کی نسوانیت وغیرہ غائب ہوتی ہے۔ وہ مختلف شعبوں میں کام کرتی ہیں اور لوازمات زینت سے بھی غافل نہیں رہتیں۔ عشق و عاشقی کو بھی گناہ نہیں سمجھتیں باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ و پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی التجا کہ

سنائیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خالی نہیں گئی۔ عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
پر مجھے تو تعجب ہے کہ جب مجاز نے پکارا کہ
آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں

تو کسی نے لبیک نہ کہا۔ کسی نے اس کے بلاوے نہ سنے۔ اجی کون سنتا ہے، ان بے جھنکار نیوتوں کو۔ کہنے والے کہتے ہیں۔ ہندوستان میں لڑکیوں کی افراط ہے۔ ہو گی شاید مگر شادی کے بازار میں۔ جہاں گرانی کے مارے ایسے ویسے کی گزر نہیں سال پڑے گھنکرتے ہیں۔ ادھر خالی جیبوں والے منہ تکتے ہیں یا پھر بلیک مارکیٹ میں اڑن کھٹولوں پر ٹکٹ لو اور ساتوں آسمان کی سیر کر آؤ۔

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

ویسے میں نے خود صنف نازک کو رونا روتے سنا ہے کہ مرد انہیں آزادی نہیں دیتے۔ اللہ جانے وہ آزادی کب ملے گی۔ اور کون لا کر انہیں دے گا۔ اور جب تک یوں ہی رونے روئے جائیں گے اور شاعر چیختے چیختے تھک جائیں گے۔ اس سپاہی کی طرح جس کا ایک ہاتھ آزاد ہو اور دوسرا مروڑ کر اس کے پیچھے پیٹھ پر باندھ دیا گیا ہو، اور پیٹھ کے پیچھے

مروڑا ہوا زخمی ہاتھ اسی طرح لاچاری سے کراہتا رہے گا۔ کاش یہ ہاتھ اپنی انگلیوں کو ہلا کر دو چار گرہیں کھول دیتا تو پھر بہت سی گرہیں آپ سے آپ سرکتی چلی جاتیں۔

میں نے مجاز کو بہت قریب سے نہیں دیکھا، اور دیکھا بھی صرف تین چار بار لیکن تینوں بار زندگی کے تین مختلف موڑ پر۔ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں، یہ مجاز کے عروج کا پرشور زمانہ تھا۔ جب نئی پود نے "آہنگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور سینے سے لگایا تھا۔ جب مجاز کے نام پر گرلز کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں۔ اور اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور جب کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں؟ اس زمانہ میں مجاز سے ملنے میں اور صفیہ ازہر کے ٹھونٹھ بھرے کھیتوں میں اپنے گٹے پھیلتے محمود صاحب کے یہاں پہنچے۔ ایک لق و دق کوٹ کے پھاٹک جیسے گریبان میں سے دو چنگاریاں سی کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں، اور یہ مجاز تھے۔ حد سے زیادہ خاموش کم سخن کم نظر قسم کے انسان اور میں نے سوچا تھا کہ یہ شاعر سب گورکھ دھندا ہوتے ہیں۔ اندھیری رات میں ریل کی وہ جنون انگیز دوڑ کا خالق اتنا آہستہ رو چیونٹی جیسی چال، پر اب سوچتی ہوں کہ مجاز اگر کامیاب شاعر نہ ہوتے تو یقیناً ریل جیسی رفتار ہوتی۔ اصول کہتے ہیں کہ یا تو جسم دوڑے یا دماغ اور ابھی چند دن ہوئے، میں نے وہ نظم پھر سے پڑھی تو مجھے دور چٹانوں پر دندناتی ہوئی ریل صاف نظر آنے لگی۔ معہ اپنی تمام گرج اور دھوم کے پر دیکھتے ہی دیکھتے وہ نولادی ہیولیٰ پگھل کر صرف خیال کی ایک مبہم سی پرچھائیں رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا معلوم ہوا یہ ریل نہ تھی

بلکہ اس کی آڑ میں مجاز کی وہ شوریدہ سر روح تھی، وہ اس کا منچلا تصور جو طوفانی تیزی سے گرجتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں۔

بے اختیار میرے دماغ میں گونج گیا اور میں نے کچھ کچھ اس کی خودسری کا اندازہ لگایا۔ اوروں کو دوڑا کر، اپنے تخیل کی لگام ڈھیلی کر کے وہ اپنی قوت عمل کی بے تابیوں کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے عمل کرنے والوں کے لئے، اور خود وہ؟ ساکت ہے بالکل خاموش پانی کی طرح ٹھہرا ہوا۔

جب محمود صاحب کے یہاں ملے تو بہت کم باتیں ہوئیں۔ صرف ایک مسئلہ پر چند سیکنڈ بحث کی۔ میں نے کہا "آپ بڑے قدامت پرست ہیں"۔ بولے کیوں؟

میں نے کہا "نرس کی چارہ گری" میں آپ نے اس کا ثبوت دیا ہے کہ جب آپ نورآ کے لبوں سے وہ لطیف شے چرا لیتے ہیں تو آپ سمجھے تھے کہ زمانۂ قدیم کی معشوقاؤں کی طرح وہ شرما کر کچھ نخرہ کرے گی، بگڑے گی۔ پر جب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو آپ کو وہ بے حیا معلوم دی کیونکہ شمع حیا جسے آپ کی قدامت پرستی نے روشن رہنے دیا ہے۔ وہ جھلملا کر رہ گئی۔

بولے "شاید ایسا ہو مگر شرمانے میں لازم نہیں کہ قدامت پسندی کا خدشہ ہو"۔

میں نے کہا "شرمانے میں کوئی نقصان نہیں، پر جب اسے قدرتی طور پر شرم نہیں آئی تھی اور صرف آپ کی خاطر سے وہ شرما دیتی تو۔۔۔۔ یہ تو"۔

"لاحول ولاقوۃ" بگڑ کر بولے "یہ تو میں کبھی نہیں چاہتا تھا"۔

"اس کے بعد سب نے ہنسنا شروع کر دیا، لہٰذا بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے بعد مجھے اور صفیہ کو پہنچانے مجاز اور محمود صاحب لالٹین لے کر آئے۔ پھاٹک پر مذاق فرمانے لگے کہ بھئی، کسی روز ہمیں بھی مدعو کیجیے۔"

ہم نے کہا "بڑے شوق سے مگر سر پر تو اباندھ کر آیئے گا۔ چوکیدار کی لاٹھی میں لوہے کی شام لگی ہے۔"

بولے "یہ پہرہ آپ لوگوں پر کب تک رہے گا۔"

"جب تک آپ لوگ چاہیں۔"

"ہم لوگ" محمود صاحب بھی بگڑے۔

"غلطی ہوئی، آپ لوگ سے میرا مطلب ہے آپ کے قبیلے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ہمارے چال چلن کا پہرے دار سمجھتے ہیں۔"

"تو ان سے لڑیئے۔" مجاز نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ بوقت فرصت انشاء اللہ۔" ہم نے جواب دیا اور پھاٹک کے اندر غڑاپ ہو گئے۔

اور پھر چار پانچ سال گزر گئے۔ کبھی کبھی اُڑتی اڑاتی خبریں ملتی رہیں پھر ۱۹۴۴ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پر ملے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ مجاز کا ستارہ شاعری ڈوب چکا تھا۔ کچھ کچھ متقدمین کی صف کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو کہو اثاثہ اتنا جمع ہو چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ پاؤں جمے رہے ورنہ اگر پشت پر "آہنگ" نہ ہوتی تو کبھی کے ختم تھے۔

ریڈیو اسٹیشن پر کوئی مشاعرہ تھا۔ ہم لوگ بھی اتفاق سے پہنچ گئے، تمام شعراء تو موجود پر آپ نہ جانے کہاں غائب اشاروں سے پوچھ گچھ ہوئی تو منتظمین نے اشارے سے بتایا کہ "شوق" کر رہے ہیں۔ توبہ!

شکر ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لوگ آپ کو سمیٹ لائے اور کرسی پر ٹکا دیا۔ اب حلیہ ملاحظہ ہو۔ میلا چست پاجامہ کان میلوں جیسا اس پر بے تکا سا اوور کوٹ گلے میں جیکٹ مفلر اور سر پر چائے پوشی۔ واہ!

مائیکروفون پر آکر نہ جانے کیا اول فول بکنے لگا۔ کلیجے میں آب آتش لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں کو قرار نہ تھا۔ ایک زمین پر تو دوسری آسمان پر۔ کبھی ایک دائیں تو دوسری بائیں کونے میں۔ ایک ہاتھ مشین کی سی رفتار سے بالوں کی ایک دیت آلود لٹ کو بار بار کنپٹی پر سے اٹھائے جا رہا تھا۔ اور وہ بے حیائی سے گرے جا رہی تھی۔ اب خوش الحانی شروع۔ اللہ جانے کیا اور کیوں بکنا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں دانت بھینچ کر نہ جانے کیا لکچر بھی دیتے جاتے تھکے ہوئے مائیکروفون سے دور نکل گئے۔ واپس لانے پر بگڑ کر بیٹھ گئے۔

"یہ ان کے منہ کو کیا ہو گیا، کیا داڑھ میں درد ہے" میں نے شاہد سے پوچھا۔

"نہیں تو، یہ تو ہمیشہ سے ہے۔ اس کے جبڑے میں" وہ بولے۔

"کوئی نہیں، پہلے تو کبھی بھی نہیں تھا" میں نے برا مان کر کہا اور مجھے کسی طرح یقین نہ آیا کہ مجاز کا جبڑا ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ یقیناً وہ مجھے جلانے کے لئے بن رہا ہے۔

اور اس دن خوب ہی تو جی جلا۔ جب باہر آئے ہم لوگ تو آپ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

اب جو باتوں کا تو مار بندھا ہے تو اللہ توبہ! وہ طویل طویل جملے جو ختم ہی نہ ہوں اور ایک میں دوسرا چڑھتا ہی چلا جائے۔ مجھے شراب پیئے ہوئے ہو کوئی تو ویسے بھی خدا وحشت ہوتی ہے کہ نہ جانے کب دھول مار دے۔ کیونکہ یہی رائے سنی ہے۔ ہمیشہ سے ان لوگوں کے بارے میں۔ اور آپ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جوار کی بوری کا منہ کھل گیا اور بھر بھر کے دانے نکل رہے ہیں۔ کیا مجال جو مہلت ملے اور کہہ سکیں کہ دلّی شہر میں تانگے مشکل سے ملتے ہیں اور رات کے گیارہ بجے ہیں۔ اب تو بخشئے۔

خیر خود ہی کچھ دل میں نیکی آگئی: "بولے صبح آؤں گا"

ایک تو مشاعرہ ہی کچھ بودا تھا۔ دوسرے مجاز کی بدحواسیاں۔ جی متلا گیا۔ اس رات دیر تک ہم مجاز کا ذکرِ خیر کرتے رہے۔ پھر فاتحہ پڑھ کر سو گئے۔

اور صبح ہی صبح کوئی چھ بجے ہوں گے کہ آپ دادا! اور کیسے کہ پہلے سے بھی زیادہ لب ریز رات والی جوار کی بوری میں معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت تک دانے پس گئے ہیں۔ اور منہ سے باتیں ایسے نکل رہی ہیں۔ جیسے کسی نے سوکھے ستو گالوں میں بھر لئے ہوں۔ اور چولہا پھونکنے کی مشق کرنا چاہتا ہے۔ جبڑا اور بھی پھنچ گیا تھا۔

باتوں کے معاملہ میں آپ مجاز کو حد سے زیادہ بے تکا پائیں گے۔ کبھی آپ ملیں گے تو نہایت ہر بات کا جواب یک لفظی، آپ گھنٹہ بھر بیٹھا لیجئے کیا مجال جو کوئی اپنج بھر سے زیادہ لمبا جملہ ہونٹوں کے پار ہو سکے۔ لیکن کسی دوسرے وقت آپ ملیں گے تو مجاز کے سوا نہ کسی سے بات کر سکیں گے۔ اور نہ کسی کی سن سکیں گے ملتے ہی فوراً آپ کے منہ پر تالا ڈال کر

کانوں کو گرفتار کرلیں گے۔ اب خواہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں، وہ خود ہر سوال کا موزوں جواب دیتے چلے جائیں گے۔ یہ حالت ان پر اس وقت طاری ہوتی ہے۔ جب دریا دلی سے بحرِ معرفت میں غوطہ لگا چکے ہوں، یہ میری دوسری ملاقات بدقسمتی سے کچھ ایسی ہی حالت میں ہوئی باتوں کے آبشار پوری طاقت سے چھوٹ پڑے۔ بولتے بولتے گلے میں پھندا سا پڑا معافی مانگ کر بولے "گلا کچھ خشک ہو رہا ہے۔" پھر جیب سے ایک بوتل نکال۔

"کوئی ایسی ویسی چیز نہیں، عرق گلاب ہے ذرا گلا تر کرلوں" دو گھونٹ لئے کاگ لگایا اور جیب میں واپس۔

"ہاں تو پھر....."

پھر ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل پڑی، اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ریل نہیں مجاز کی زبان ہے جو چل رہی ہے ؎

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

اس شعر کو پڑھ کر ہمیشہ مجھے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا گویا کوئی جملہ احساسات کو طوفان میل کی رفتار سے دوڑا رہا ہے۔ جذبات ریل کی جھپٹ کے ساتھ اڑنے لگے ہیں اور دماغ زقندیں بھر رہا ہے اور میرا جی چاہا مجاز کا منہ کوئی بند کر دے تاکہ یہ لاابالیوں بکواس بن کر ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مگر بوتل میں کاگ تو جب ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جب کہ وہ ثابت و سالم ہو۔ اگر چکنا چور ہو چکی ہو تو الٹا ہاتھ کٹ جائے گا۔

تو کوئی کھلے ہوئے منہ کو بند نہ کر سکا۔ اور موتی یوں ہی رُلتے رہے۔ میں نے موتی اس لئے کہا کہ مجاز کی زبان نہایت پاکیز۔ اور ستھری ہوئی ہے۔ عام طور پر بات کرنے میں ترشے ہوئے پنے تلے ذومعنی جملے بے تکان بنتے چلے جاتے ہیں۔ مجاز کی زبان کی دھار تو کچھ جوش کی صحبت ہی میں خوب چمکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے پنچ سے لڑ رہے ہیں اور پھر مزہ یہ کہ جملے نہایت ہی مختصر مگر دو دھارے ہوتے ہیں جو کاٹتے ہیں۔ پر الجھتے کہیں نہیں۔

میں نے یہ غلط کہا تھا کہ مجاز بحرِ معرفت میں غوطہ لگانے کے عادی ہیں، دراصل میرا مطلب تھا وہ شراب پیتے ہیں اور حماقت کی حد تک پیتے ہیں۔ پیتے وقت صرف ایک بات کا خیال رہتا ہے کہ جلد از جلد پیئں اور بہت سی پی لیں تاکہ دوسروں سے زیادہ حصہ میں، جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ حالت خراب ہو جاتی ہے۔ وقتی طور پر تو کچھ نہیں۔ بعد میں یہ آگ کی بارش جب متواتر معدے اور جگر پر ہوتی ہے تو صحت کا کوئی سوال ہی ایک سرے سے نہیں رہتا۔ شاید یہی وہ سب سے شدید مرض ہے جو جان کو لاگو ہے۔ جس نے جسم کو کھوکھلا کر دیا ہے اور دماغ پژمردہ ہو گیا ہے۔ ایک تو کڑوا کریلا اوپر چڑھا نیم بالکل ہڈیوں اور کھال کا معاملہ باقی ہے۔

تو یہ دوسری ملاقات نے وہی سہی دلچسپی بھی ختم کر دی۔ سنی سنائی پر ٹال بھی سکتے تھے۔ پر چشم دید حالت پر تو خلوص دل سے فاتحہ پڑھنے کا حق حاصل ہو گیا۔

خدا خدا کر کے چائے آگئی اور باتوں کے بہاؤ میں کچھ کمی ہوئی۔ ادھر سے بھی دو چار سوالات کئے گئے کہ بھئی اتنے سویرے کیسے آگئے۔ جواب ملا کہ ریڈیو اسٹیشن سے تانگہ لے کر اس وقت سے جو چلے تو صبح تک شہر میں چکر لگا رہے تھے۔ تانگہ والے سے کہہ دیا تھا کہ بھیا تیرا جی چاہے

جہاں سے چلے۔ بیچ میں دو چار جگہ لوگوں کو جگا جگا کر شرفِ ملاقات بھی بخشتے آرہے تھے۔

پھر کچھ موڈ میں آگئے اور نظم سنانا شروع کی۔ بیچ بیچ میں اتنی باتیں کرتے گئے کہ جی جل گیا۔ دھوپ نکلنے نکلنے کچھ روپ رنگ اترنا شروع ہوا تو کچھ خاموش ہو گئے۔ پھر ہم لوگ باہر آگئے۔ تو اتر کر راستہ میں کسی کتب فروش سے اتنی دیر باتیں کیں کہ مجبوراً انہیں چھوڑ کر جانا پڑا۔

اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہ ملی اور نہ ہی کچھ دیر ڈھونڈی گئی کہ کچھ ماہ ہوئے سنا کہ پنجلے انہیں بمبئی سیمنٹ لائے ہیں۔ یہ بھی برا نہ ہوا۔ کون جانے شاید اب بھی بین ٹبور کر کام چلایا جا سکے۔ اور اب تیسری دفعہ جب ملی تو دیکھا کہ کچھ صورت ہی دوسری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گزر گئے ہیں۔ جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اڑا کر لے گئے۔ جیسے نہ یہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ کسی شدید بیماری کے حملے نے بالکل سن کر ڈالا ہے۔ چہرہ کو غور سے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس شخص کو خبر ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا آنکھوں میں ایک غائرانہ تغافل جیسے کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار مختلف گروہوں میں دیکھا، اسی طرح غیر حاضر قسم کا وجود کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا۔ چلتے دیکھ کر چل پڑنا بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے پیچھے سرک جانا۔ عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا۔ جسم تو موجود ہے۔ مگر آگے سراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات کہاں بھٹک رہے ہیں۔ مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح آواز گویا کوسوں دور سے گرتی پڑتی چلی آرہی ہے۔ داد دیتے جی ڈرتا ہے کہ کہیں سچ مچ اسٹیج سے نیچے نہ گر پڑیں۔

مگر قسمت سے ساتھی کچھ ایسے بے ڈھب مل گئے ہیں جو انہیں کانچ کے گلاس کی طرح اٹھائے پھرتے ہیں۔ مگر واہ رے دم خم جوں ہی موقع مل جاتا ہے۔ یہ کانچ کے گلاس صاحب فوراً چٹان سے سر دے مارتے ہیں۔

لوگوں نے رائے دی کہ پیسے کماؤ پیسے۔ اللہ نے چاہا تو سارے روگ دور ہو جائیں گے۔ آپ نے دو چار فلمی گانے لکھ پیسے کما ڈالے اور فوراً اللہ شافی کر گئے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ ڈر لگنے لگا کہ اگر فراغت ہوئی تو تنگی اور بڑھ جائے گی۔

لیکن حال ہی میں کچھ دنوں سے مجاز کو شاید یقین ہو گیا ہے کہ وہ چند خدائی فوجدار قسم کے لوگوں میں آن پھنسے ہیں جو انہیں یوں سستے داموں کھونے کو تیار نہیں ہوں گے۔ پہلے تو جناب کچھ جز بز ہوئے اور دھمکی دی کہ اگر لوگوں نے پیچھا نہ چھوڑا تو چلے جائیں گے۔ واپسی پر اب کچھ ہاتھ ڈھیلے کر رہے ہیں اور وہ لوگ ڈھٹائی کی حد تک پہنچی ہوئی کوششوں سے انہیں گھسیٹ کر اس خود فراموشی کے غار میں سے واپس نکال رہے ہیں جس میں ڈوبنے پر وہ مصر ہیں اور اب تو خدشہ ہو چلا ہے کہ وہ انہیں کھینچ ہی لائیں گے۔

یہی وجہ ہے شاید، جو اب کبھی مجاز کہیں ملتے ہیں تو لوگوں کو ایسے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہیں کہ "ہاں، ہاں" کچھ یاد تو پڑتا ہے کہیں دیکھا ضرور ہے" اور وہ مہانوں جیسا سایہ چہرے پر سے سرکتا جا رہا ہے۔ وہ علی گڑھ لکھنؤ کی پر لطف صحبتیں جو افسانہ بنتی جا رہی تھیں پھر کچھ کچھ زندہ ہو رہی ہیں۔ ایک ہلکی سی پھریری تو لی ہے۔ اب دیکھنا ہے جان کب پڑتی ہے۔

ویسے تو مجاز نے ایک پتلی سی کتاب مکمل کر کے، ادب اور شاعری کو اتنا کچھ دے دیا ہے

کہ ہم نے ان کا نام چوٹی کے شعرا میں بڑی آسانی سے شمار کر لیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ ساری عمر اس کا تکیہ لگائے مزے سے بیٹھے رہیں۔ اگر وہ چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ یہ قیامت جیسے طوفان بھرے زمانہ میں اگر وہ لمبی تان کر سونا چاہیں تو آنکھیں بھلے ہی بند رہیں نیند نہ آئے گی۔ دنیا تو اس تیزی سے قلابازیاں کھا رہی ہے، ایسے وقت میں یہ چپ کا روزہ کب تک؟

نہ جانے میں نے کیا کچھ لکھ ڈالا۔ شاید کوئی بات مجاز کو ناگوار گزرے۔

مگر سنا ہے مجاز کو اگر کوئی بات بُری لگے تو وہ خاموش خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے، خیر جی مجھے کوئی پرواہ نہیں، اگر کوئی بات انہیں بُری لگے تو شوق سے لگا کرے۔ بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ کوئی بات انہیں ایسی بری لگے کہ وہ بھنّا اٹھیں، اور ان کا قلم برس پڑے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس بار جو کچھ ان کے قلم سے ٹپکے گا۔ آہنگ سے بھی بلند ہوگا۔ کیونکہ آج کے مجاز میں اور دس برس پہلے کے مجاز میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک جوشیلا باغی لڑکا تھا اور اب بھگتا ہوا جھیلا سوا مرد ہے۔ وہ ایک دوڑتا اُچھلتا آبشار تھا۔ اور یہ ایک بند باندھا ہوا دریا۔

دیکھنا ہے یہ بند کب ٹوٹتا ہے۔

⁂

ساس

سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک بڑھیا کے گھر میں ہی گرمی اور روشنی پر تُلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رُخ سے گھسیٹی اور اسے لودہ پھر پیروں پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم اور ھٹھوں کی آواز چھت پر سے آئی۔

خدا غارت کرے بیمارے پیٹی کو۔ ساس نے بنے حیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اُڑا رہی تھی۔

دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جیئے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر، ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آن پہنچا پھر کیا مجال ہے کوئی آنکھ

جھپکا سکے۔

"بہو.... ق.... بڑھیا نے بلغم بھرے حلق کو کھڑکھڑا کر کہا داری او.... بہو"

"جی آئی" بہو نے بہت سی آوازوں کے جواب میں کہا۔ اور پھر وہی دھما دھم جیسے کھوپڑی پر بھوت ناچ رہے ہیں۔

"ارے تو آچک خدارا — خدا سمجھے تجھ سے"

اور دھم دھم۔ چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اتری اور اس کے پیچھے کتوں کی ٹولی ننگے۔ آدھ ننگے، چیچک منہ داغ، ناکیں سڑسڑاتے کوئی پون درجن بچے۔ کھی کھی، کھی کھی، کھوں کھوں، سب کے سب کھمبوں کی آڑ میں شرما شرما کر ہنسنے لگے۔

"الٰہی یا تو ان حرامی پلوں کو موت دے دے یا میری مٹی عزیز کرلے نہ جانے یہ اٹھائی گیرے کہاں سے مرنے کو آجاتے ہیں — چھوڑ دیئے جن جن کے ہماری چھاتی پر مونگ دلنے کو — اور نہ جانے کیا کیا۔ پر بچے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو گھونسے دکھاتے رہے۔

"میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے — جو —"

"واہ تم تو مر گئی تھیں" بہو نے بشیریا کے کہنی کا ٹہوکا دے کر کہا۔

بڑھیا جملے کو اپنی طرف مخاطب سمجھ کر تلملا اٹھی۔

"جھاڑو پھیروں تیری صورت پر — مریں تیرے ہوتے سوتے، تیرے...."

"ماں۔ ہم تمہیں کب کہہ رہے تھے۔ بہو نے لاڈ سے ٹھنک کر کہا۔

مگر بڑھیا کوسے گئی اور بچوں کو تو ایسا آٹے ہاتھوں میں لیا کہ بے چاروں کو منہ چڑانے

بھاگتے ہی بنی۔

بہو بھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

" دنیا جہاں میں کسی کی بہو بیٹیاں یوں لونڈوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی ہوں گی؟ دن ہے تو لونڈھیار۔ رات ہے تو.... ساس تو زندگی سے تنگ تھی۔

" عن عن، عن عن " بہو منمنائی۔ اور طوطے کے پنجرے میں پنکھے سے تنکے نکال کر ڈالنے لگی " ٹیں، ٹیں، طوطا چنگھاڑا "

" خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے۔" ساس غرائی۔

" تو یہ بولتا کیوں نہیں " بہو نے جواب دیا۔

" تیری بلا سے نہیں بولتا۔ تیرے باپ کا کھاتا ہے۔ ساس نے پہلو بدل کر کہا۔"

" ہم تو اسے بلائیں گے " بہو نے اٹھلا کر طوطے کے پیچھے میں تنکا کونچ کر کہا۔

" آئیں — آئیں — اے میں کہتی ہوں تیرا جیتا ہی گھل گیا ہے۔ اب ہٹتی ہے وہاں سے کہ لگاؤں — بڑھیا نے دھمکی آمیز پہلو بدل کر کہا۔

اور جب بہو نے اور سلگایا تو کھٹائی کی شکل کی جوتی اٹھا کر ایسی تاک کر ماری کہ گھڑونچی کے نیچے سوئے ہوئے کتے کے لگی جو بلبلا کر بھاگا۔ اور بہو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑھیا نے دوسری جوتی سنبھالی اور بہو کھمبے کی آڑ میں ہو گئی۔

" آئے دے اصغر کے بچے کو۔"

" بچہ..... بچہ کو بچے کے نام پر بجائے شرمانے کے ہنسی دبانا پڑی۔"

"تھوہے تیرے جنم پر ـــ اور کیا بچہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بھاگوان آتی جس دن سے قدم دھرا۔ گھر کا گھر ڈھا ہو گیا۔"

بہو اور مسکرائی اور طوطے کا پنجرہ جھکول ڈالا۔

"میں کہتی ہوں یہ طوطے کی جان کو کیوں آ گئی ہے۔"

"تو یہ بولتا کیوں نہیں ـــ ہم تو اسے بلائیں گے۔"

بڑھیا جل کر کوئلہ ہو گئی۔

"یہی ڈھنگ رہے تو اللہ جانتا ہے دوسری نہ کرلائی ہوں تو نام نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

دھوپ ڈھل کر گھڑونچی اور پھر وہاں سے کنڈلی پر پہنچی۔ ساس بڑبڑاتی رہی۔

"نوئے نفقتے، بیٹی کو جہیز کیا دیا تھا۔ اے واہ قربان جایئے خولی کرٹے ۔ اور ملمع کی بالیاں، اور ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو ہم کیا کریں" بہو پوپڑ بیٹے سے بولی۔ اور کھٹولی پر لپیٹ کر لیٹ گئی۔

"اور وہ المونیم کے ـــ جمائی لے کر بڑھیا نے پٹاری پر سر رکھ کر ذرا ٹانگیں پھیلا کر کہا ـــ اور پھر سونے سے پہلے وہ ممدھنوں کے گھٹنوں پر سے گھسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں، پھیکے زردے اور گھنے ہوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی مگر بے حیا بہو آدھی کھٹولی اور آدھی زمین پر لٹک کر سو بھی گئی۔

بڑھیا کی بڑبڑاہٹ بھی خراٹوں میں نہ جانے کب بدل گئی۔

اصغر چھتری کو کندھے سے لگا کر کھڑا ہو گیا اور کھتی آچھائے والی نیلی واسکٹ کو اتار اتار

کرکرتے سے پسینے کے آبشار پونچھتے ہوئے دالان میں قدم رکھا۔ پہلے بڑی احتیاط سے ایک شریر بچے کی طرح ردھٹی سوئی ہوئی بڑھیا پر نظر ڈالی۔ اور پھر بہو پر، آموں اور خربوزوں کی پوٹلی کو زمین پر رکھ کر کچھ سر کھجایا اور جھک کر بہو کی بانہہ بھینچ دی۔

"اوں —" بہو تیوریاں چڑھا کر اینٹھی اور اس کا ہاتھ جھٹک کر مڑ کر سو گئی۔

اصغر نے پوٹلی اٹھائی۔ جیب میں نئی چوڑیوں کی پڑیا ٹٹولتا کوٹھڑی میں چلا گیا۔

بہو نے ہوشیار بلی کی طرح سر جھکا کر بڑھیا کو دیکھا اور دوپٹہ کو کدھیرتی جھپاک سے کوٹھڑی میں۔

لُو۔ رک گئی۔ پسینے کے تراٹے چل نکلے۔ مکھیاں آموں کے چھلکوں اور کوڑے سے نیت بھر کے منہ کا مزہ بدلنے بڑھیا کے اوپر رینگنے لگیں، دو چار نے باچھوں میں بہی ہوئی پیک کو چکھنا شروع کیا۔ دو چار آنکھوں کے کوئے میں تندہی سے گھسنے لگیں۔

کوٹھڑی میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری چنچناہٹ۔

"اوں — اوں" سنائی دیتی رہی۔ ساتھ ساتھ خربوزوں کے چھلکے اور آموں کے چوڑنے کی چپڑ چپڑ آواز سکون کو توڑتی رہی۔

مکھیوں کی چہلوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا پھڑپھڑا اٹھی۔ یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی — پیدا ہوتے ہی گھٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سونے کیا جاگتے بس آنکھ، ناک اور ہونٹوں کی طرح جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ رہتی تھیں۔ اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں

تھی جب کاٹا۔ پھر جب انا ڈگئی تو برسات میں پھر کاٹا۔ اور نو سندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اسے اس کے جسم کے کون سے مخصوص حصے سے انس ہے تو وہ مزدور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دے دیتی۔ مگر وہ تو ہر حصہ پر بیٹھتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اس خاص کٹکھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی چتلے پر ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا جھپاکا مارتی۔ مکھی تن تن کر کے وہ گئی۔

آہ معبود! اسے کتنا ارمان تھا کہ وہ کبھی تو اس مکھی کو مار کے لنگڑا ہی کر دے۔ اس کا بازو مروڑ کر مرغی کی طرح گڈی باندھ کر ڈال دے اور مزے سے پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر تڑپتا دیکھے مگر خدا تو شاید اس مکھی سے بھی شیطان کی طرح قول ہارے بیٹھا تھا کہ بس ستائے جائے اس کی ایک حقیر بندی کو، نہ جانے اس میں کیا مزہ آتا ہے۔ مگر اسے یقین تھا کہ اس دو زخی مکھی کا گریبان — اس مکھی کی فریاد مزدر اس قہار و جبار کے حضور میں لے کر جائے گی اور مزدور فرشتے اسے خون پیپ پلا کر کانٹوں پر سلائیں گے۔۔۔۔ مگر پھر۔۔۔۔ کیا یہ موٹی موٹی مکھیاں بھی جنت میں جائیں گی! — اور ساری جنتی فضا مکدر ہو جائے گی۔ بڑھیا نے پنکھے کی پتوار بنا کر چھپا چھپ اپنے منہ ہاتھوں اور سوکھے پیروں کو پیٹ ڈالا۔

"بہو — اے بہو مر گئی کیا؟" وہ جل کر چلائی۔

اور بہو تڑپ کر کوٹھڑی سے نکلی۔ دوپٹہ ندارد۔ گریبان چاک ہاتھ میں آم کی گٹھلی، جیسے کسی سے کشتی لڑ رہی ہو — پھر فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی۔

"ارے بہو — میں کہتی ہوں — ارے دو بوند حلق میں پانی —"

اصغر بھی شلوار کے پائنچے جھاڑتا کرتے کی پوٹلی سے گردن نکالتا آیا۔

لو اماں۔" کیا خوشبودار امیاں ہیں۔" اس نے بڑھیا کی گود میں پوٹلی ڈال کر کہا۔ اور کھٹولی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

بڑھیا آموں اور خربوزوں کو سونگھ سونگھ کر مکھیوں کی نا انصافی کو بھول گئی۔ جواب آموں کی بونڈیوں کا معائنہ کرنے کے لئے اس کی باچھوں سے اتر آئی تھی۔

"اے بہو چھری....."

بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں پر سے چاٹا۔ اصغر نے پیر بڑھا کر بہو کی پنڈلی میں بکچا بھر لیا۔ پانی چھلکا اور بڑھیا غرائی۔

"اندھی میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے۔" اور ایسا کھینچ کر ہاتھ مارا کہ گلاس سمیت بھاری پیندے کے بہو کے پیر پر۔ بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا اور چلدی تن تنہائی

"اماں لو پانی —" اصغر نے فرمانبردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا۔" یہ بہو تو بڑی دہ ہو گئی۔"

"تمہیں دیکھو۔" بڑھیا نے شکایت کی۔

"نکال دوں مار کے حرامزادی کو۔ اماں اب دوسری لائیں یہ تو —" اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھ کر کہا۔

"اے زبان سنبھال کمینے! —" بڑھیا نے آم پلپلا کر کہا۔"

کیوں اماں دیکھو نا کھا کھا کر بھینس ہو رہی ہیں۔" اس نے بڑھیا کی آنکھ بچا کر کمر میں چٹکی بھر کے کہا۔ اور بہو نے چھری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھری بڑھیا کے گٹے پر ٹیخ دی۔ جو تلملا گئی۔

"دیکھتی ہو اماں — اب ماروں چڑیل کو۔" اور لپک کر اصغر نے دیا دھو کا بہو کی پیٹھ پر۔ اور فرمانبردار بیٹے کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

خبردار رہو — اور سنو۔ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی۔ اب کے جو تو نے ہاتھ اٹھایا۔

بڑھیا غنیم کی طرفداری کرنے لگی۔ کوئی لائی بھگائی ہے .... جو تو — اے میں کہتی ہوں پانی لا دے۔ اس نے ایک دم پھر بہو پر برسنا شروع کیا۔

بہو کھمبے سے لگ کر منہ تھوتھا کر بیٹھ گئی۔ اور گلاس سے زخمی ہوئے انگوٹھے کو دبا دبا کر خون نکالنے لگی۔ بڑھیا مزے سے آم کی گٹھلیاں چوڑتی رہی۔ پھر شکر کا ڈبہ دیتے ہوئے کچھ ایسا بڑھا کے پاؤں رکھا کہ خون سے لتھڑا انگوٹھا بڑھیا نے دیکھ ہی لیا۔

اوئی یہ خون کیسا — ؟ پر بہو روٹھ کر پھر کھمبے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اور خون بہنے دیا۔

"اے میں کہتی ہوں ادھر آ — دیکھوں تو خون کیسا ہے۔ بڑھیا نے پریشانی چھپا کر کہا۔"

بہو ہلی بھی نہیں۔

"دیکھو تو — کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے۔ اصغر اٹھ تو ذرا اس کے پیر پر ٹھنڈا پانی ڈال —" ساس بھی گرگٹ ہوتی ہے۔

"میں تو نہیں ڈالتا"، اصغر نے ناک بیکڑ کر کہا۔

"حرامزادے!" بڑھیا خود گھسٹتی ہوئی اٹھی۔

"چل بیٹی پلنگ پر — اسے میں کہتی ہوں یہ گلاس موا سوا سیر کا ہے۔ اس کمینے سے کہا ہلکا المونیم کا لادے۔ مگر وہ ایک حرام خور ہے۔ لے اُٹھ ذرا۔"

بہو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بلکہ کہنی آگے کر کے جھوٹ موٹ ناک دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"لا پانی ڈال صراحی میں سے۔" اور اصغر سینے پر پتھر رکھ کر اٹھا۔

" بڑھیا سوکھے سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ بجائے زخم پر پانی ڈالنے کے وہ بہو کے گریبان میں ڈال رہا ہے۔ اور بہو اس تاک میں ہے کہ قریب آتے ہی اصغر کا کان دانتوں سے چبا ڈالے۔

وہ ایک دم بکھر گئی۔

"خاک پڑے تیری صورت پر۔" بڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے پر سوکھے پنجے سے بدھیاں ڈال کر کہا۔

اور اس نے ایک سسکی لے کر جل کر سارا پانی بہو پر لوٹ دیا۔ اور خود روٹھ کر آم کھانے چلا گیا۔ ماں بیٹے کے لئے ڈھائی گھڑی کی موت آنے کا ارمان کرنے لگی۔

" بدذات ٹھہر جا۔ آنے دے اپنے چچا کو — وہ کھال ادھیڑ دائی ہو کہ بس —"

بڑھیا نے میلی دھجی کی پٹی باندھ کر کہا۔

"لے بس اب پلنگ پر لیٹ جا۔" بڑھیا نے زخم کو انتہائی خطرناک بنا کر کہا اور

پھر بہو کے نہ ہلنے پر خود ہی بولی۔ "اسے ہاں — ہے اصغر بہو کو کھٹولی پر پہنچا دے۔"

"مجھ سے تو نہیں — یہ موٹی موٹی بھینس کی بھینس۔" اصغر جل کر بولا۔

"ارے تیرے تو باپ سے اٹھے گی — بنتا ہے کراب —"

اور جب وہ پھر بھی بیٹھا رہا تو بڑھیا خود اٹھانے لگی۔

"اماں۔ میں آپ اٹھ جاؤں گی —" بہو نے بڑھیا کی گدگدیوں سے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی — بس —" اور پھر اس نے اصغر کی طرف آنکھیں گھما کر دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہے کہ ٹھہر جاؤ میاں دودھ نہ بخشوں اور پھر نہ بخشوں۔

اصغر بھنا کر اٹھا اور ایک جھپاکے سے بہو کو اٹھا کر چلا کھٹولی کی طرف۔

بہو نے موقع کی مناسبت سے فوراً فائدہ اٹھا کر اسی جگہ دانت گاڑھ دیئے جہاں ابھی ساس کا سوکھا پنجہ پڑا تھا۔ اور اصغر نے کچکچا کر اسے کھٹولی پر پٹخ دیا۔ اور اس کے سرخ سرخ ہونٹ چٹکی سے مل دیئے۔

بہو ناک چھپا چھپا کر فتح مندانہ طریقے پر ہنستی رہی اور اصغر اپنے نیل پڑے ہوئے کندھے کو سہلا سہلا کر غرّاتا رہا — ساس وضو کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ بڑبڑاتی رہی — شاید بے حیا بہو کو کوس رہی ہوگی۔

⁂

چابڑے

کتنی بار قلم اٹھاتی ہوں اور رکھ دیتی ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں لکھ پائی کہ چابڑے کو اصل میں چچا بڑے کہنا چاہیئے تھا۔ مگر لوگ جلدی میں انہیں چابڑے ہی کہتے تھے۔ ان کا اصل نام تو تمیز الدین یا امتیاز الدین یا ممتاز الدین تھا۔ غرض الدین، ضرور لگا ہوا تھا۔ حالاں کہ دین دھرم سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نماز بھی وہ کبھی بھولے بھٹکے سے ہی پڑھ لیتے تھے۔ وضو سے جوانی میں جوانی کی وجہ سے اور بڑھاپے میں دمہ کی وجہ سے رکھ ہی نہ سکے ان کو ہاتھ لگانے سے بھی مجبور تھے۔ کیونکہ دمہ کے ساتھ مثانہ کی کمزوری کی بھی شکایت تھی اس لیئے وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ اور سینکڑوں لتوں کے ساتھ عورتوں کی لت بھی جان کو لگی ہوئی تھی، لہذا ہزاروں کمانے کے باوجود حج کو جانے کی توفیق نہ ہوئی۔

شاید کبھی "چابڑے تندرست" بھی ہوں گے، مگر میں نے تو انہیں ہمیشہ چھینکتے

کھانستے بڑی ہڑکھاتے دیکھا اور چوبیس گھنٹوں میں سے چودہ گھنٹے موری پر بیٹھے دیکھا۔ جب وہ چلتے تھے تو اُن کے پیچھے مکھیوں کا ایک جلوس چلتا تھا اور فضا سڑی ہوئی مچھلیوں کی بدبو سے بوجھل ہو جاتی تھی جدھر بھینس، گھوڑا اور مرغیاں رہتی ہیں اُدھر ہماری شاندار کوٹھی کے غیر ضروری کونے میں چابڑے کی کوٹھری تھی پاس ہی کالی کیچڑ سے بھری ایک موری تھی جو نوکروں کے پاخانہ سے گزر کر پیچھے کھیتوں میں رستی تھی۔ نہ جانے چابڑے کے جسم سے کونسا تیزاب نکلتا تھا۔ کہ جہاں سے وہ موری کالی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی گزرتی تھی اُس پاس کی ساری ہریالی جل جاتی تھی۔

مگر سب سے زیادہ شرم کی بات جو تھی وہ یہ کہ چابڑے ہمارے بہت ہی قریب کے رشتے دار تھے۔ ان سے خون کا رشتہ تھا، حالاں کہ خون کا رشتہ اب باقی نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ بزرگوں کا سارا خون کالی کیچڑ بن کر موری میں بہہ چکا تھا۔ لہذا یہ خونی رشتہ سراسر بہتان رہ گیا تھا۔

مگر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں چابڑے کو عشق بھی ہوا تھا۔ عمدہ خالہ ان کی چچازاد بہن بچپن سے اپنے پھپیرے بھائی کو منگی ہوئی تھی ان دنوں منگنی نکاح کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک دن چچا بڑے نے کنکیا اُڑاتے وقت ٹٹی پر سے عمدہ خالہ کو دھوپ میں پلنگڑی کی آڑ میں نہاتے دیکھ لیا۔ پلنگڑی کچھ ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ عمدہ خالہ کے دودھ جیسے پنڈے کو صرف بان کے جالی کا عکس ڈھانکے ہوئے تھا۔ چابڑے کی کنکیا کٹ گئی، ڈور لٹ گئی اور وہ بے سدھ دودھ پر تیرتے ہوئے سُرمئی جال میں اُلجھے غوطے کھاتے رہے۔ عمدہ خالہ جلی مچھلی کی طرح

اس جال میں مچلتی رہیں۔

اس وقت عمدہ خالہ کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ کیا زمانہ لوٹ گیا ہے آج کل کی گیارہ برس کی لونڈیاں جانگیے پہنے لڈ کڈے لگاتی پھرتی ہیں کوئی ان کی طرف نظر بھر کے بھی نہیں دیکھتا، عشق تو بڑی بات ہے۔

چابڑے نے سر پٹخ دیا، مگر عمدہ خالہ کے بابا نے ان کی ایک نہ سنی۔ اور عمدہ خالہ بیاہ کر اپنی پھوپی کے ہاں چلی گئیں۔ بس جانو اسی دن سے چابڑے کا بھیجہ لوٹ گیا۔

قاعدے سے کہانی یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے اور میرا قلم ٹھوکر کھا کر ستانے کو رک جاتا ہے آگے لکھنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ چابڑے نے نہایت غیر شاعرانہ حرکتیں کیں، نہ تو انہوں نے دشت پیمائی کی اور نہ سر میں میخ مار کر جان دی اگر وہ بھی رانجھا، مہینوال یا پنوں ہی بن جاتے تو آج کو ان کی بھی اسر کہانیاں لکھی جاتیں۔ جس کی نعلیں بنتیں اور تب مجھے اتنی دقت ان پر قلم اٹھاتے دقت نہ پڑتی جتنی اب پڑ رہی ہے۔

دو چار دن مرنہہ اندھائے پڑے رہنے کے بعد انہیں عشق کی گرد جھاڑ کر اٹھنا ہی پڑا۔ کیونکہ دادا ابا نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر مجنوں بننے کا پروگرام رکھتے ہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سارا عشق ناک کے رستے نکل جائے گا۔ وہ مثل مشہور ہے کہ مار سے بھوت بھاگتا ہے تو پھر بھلا حضرت عشق کی کیا مجال تھی جو دادا ابا کے نعل دار جوتے کے آگے کچھ غرّا دکھاتے۔ چابڑے کو انہوں نے اپنے ایک پہلوان دوست کو سونپ دیا اور سمجھا دیا کہ ایسے گھسے دو کہ سارا زنگ اُتر جائے۔

رنگ اُتر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چابڑے چھ فٹے پہلوان بن گئے۔ جب وہ محلہ میں انگڑائی لیتے تو لوگ اپنی کنواری بیٹیوں کو کوٹھڑیوں میں بند کر کے تالہ لگا دیتے۔ شہر میں کوئی دنگا فساد ہوتا، جڑ میں چابڑے کا ہاتھ ہوتا۔ رنڈیوں کے کوٹھے تو اسٹیشن تھے جہاں وہ دم بھر کو رُکتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کا ذریعہ آمدنی کیا تھا کسی کو نہیں معلوم تھا مگر وہ ہمیشہ چالیس ہزار کے لٹھے کا گھٹنا اور باریک ولائتی تنزیب کا کُرتہ پہنے جگمگ کرتی کامدار جوتی مگر سر پر بجائے ٹوپی کے شکاری ہیٹ پہنتے۔ سفید براق کپڑوں میں ان کا سیاہ جسم آبنوس کی طرح چمکا کرتا۔ ان کی رنگت میں سیاہی اور کچھ سبزی مائل نیلاہٹ جھلکتی تھی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ جلد کے رنگ سے ایک جھلک زیادہ گہری مونچھیں اور بال۔ دبنگ آواز جیسے زرخرے میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہو۔ دل پر زخم کھا کر چابڑے بھری بندوق ہو گئے۔

"شادی ہو جائے گی تو سنبھل جائے گا۔" دادی بی کہتیں اور وہ رنگ برنگی لڑکیوں کے نقشے انہیں للچانے کو ان کے سامنے کھینچا کرتیں، مگر چابڑے وہی ایک بات کہتے۔ شادی تو ہو سکتی ہے اماں جی۔

"کس سے کرنا ہے۔ مجھے تو بتا سہی" وہ شوق سے پوچھتیں۔

"عمدہ خانم سے"

اور دادی بی سر پیٹ لیتیں "ہے جوانی مرگ بیاہی عورت پر داغ لگاتا ہے۔ تیری زبان کو آگ لگے۔"

"تو بیوہ ہو سکتی ہیں عمدہ خانم" چابڑے کی کالی کالی مونچھوں میں سفید دانت چمکتے اور دادی بی

لرز اٹھتیں۔ چابڑے کا کیا بھروسہ، ایک دن ایک رنڈی ان سے روٹھ گئی یہ گئے تو ان کی طرف سے موہنہ پھیر کر اپنے نئے گاہک سے لاڈ کرنے لگی۔ چابڑے نے چوٹی پکڑ کر اسے اپنی طرف موڑ لیا۔ گاہک بھی اُلجھ پڑا۔ چابڑے نے اُٹھا کر اُسے دو منزلے سے نیچے پٹخ دیا۔ رنڈی نے پولیس کو کھلا پلا کر بات دبا دی۔ چابڑے کو بھی معافی دے دی۔ مگر چابڑے نے اسے موٹی سی گالی دی۔ پھر بہت پچھتائے کہ خواہ مخواہ بے چاری گالی کی ذلت ہو گئی۔

چابڑے زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگے۔ پھر شہر سے باہر رہنے لگے۔ کبھی سال دو سال میں آجاتے۔ تین چار یار دوست اور خوشامدی ساتھ چپکے ہوتے ڈھیروں روپیہ لاتے۔ سارے محلے کے لونڈے جمع کر کے کبڈی گلی ڈنڈا اور دنگل جمائے جاتے۔ دادی بی کے لکڑی کے صندوق میں روپیہ جمع کرا دیتے۔ صبح مٹھی بھر روپے لے کر اس کے پیسے بھنا لیتے اور خود مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے اور لونڈوں کا جم غفیر انہیں گھیر لیتا۔ نی پیسہ ایک چپت کے حساب سے بھاؤ ٹھیرایا جاتا۔ لڑکا سر جھکاتا، حسب عزدرت چپتیں دھول کر کے دام چکا دیئے جاتے۔ جب مارتے مارتے ہاتھ شل ہو جاتے تو یار دوستوں کو چپتیں خرید کر تقسیم کر دی جاتیں۔ اب بھی روپے بچ جاتے تو موسم کا پھل یا مٹھائی منگا کر بانٹ دی جاتی۔ جو کم پڑ جاتے تو کاٹھ کے صندوق سے دوسری مٹھی نکل آتی۔

اور جب کبھی عمدہ خانم کا نام آتا چچا دادی بی سے کہتے "عمدہ خانم سے کہو اس نامراد کو چھوڑ دو۔ ورنہ کسی دن داؤں لگ گیا تو عمدہ خانم کو ہی پار کر دوں گا۔"

اور دادی بی بھی جوتی لے کر چابڑے پر ٹوٹ پڑتیں "اے تجھے ہیضہ ہو..... تجھے

ڈھائی گھڑی کی سمیٹے، بال بچوں والی کو داغ لگاتا ہے۔"

اور چچا ہنستے ہوئے مٹھی بھر روپیہ لے کر بھاگ جاتے۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو ایک دم چابڑے غائب ہو جاتے۔ دادی بی ان کے پیسے کو ہاتھ لگانا حرام سمجھتی تھیں۔ فقیر کو دیتے بھی کراہت محسوس کرتیں۔ جسم کے کپڑوں کے علاوہ وہ کچھ ساتھ نہ لے جاتے۔ ان کے جانے کے بعد دادی بی ان کے کپڑے اور بستر لپیٹ کر خیرات خانہ بھجواتیں۔

چابڑے کو مستقل قسم کی چیزوں سے بڑی نفرت تھی۔ ایک دفعہ جو آئے تو ایک میلی کچیلی گنواری کو بھی ساتھ لے آئے۔ کسی کو کچھ اس کے رشتہ کا پتہ نہ تھا۔ ہاں وہ رات کو ان کے پیر دباتی تھی۔ معلوم ہوا دھوبی کی عورت بدھیا کو بھگا لائے ہیں۔ دادی بی نے ماتھا کوٹ لیا۔

"نکال دو سالی کو" چابڑے لاپرواہی سے بولے۔

مگر اس نے وہ واویلا مچائی کہ توبہ بھلی۔ اس کا میاں بھی ایک آدھ دفعہ آیا۔ کہنے لگا "اب میرے کام کی نہیں رہی" اور کچھ روپے لے کر چلا گیا۔ اس کا ایک لڑکا بھی تھا جسے چابڑے کبھی ساتھ لئے چلے آتے۔ انگلی پکڑا کر اسے بازار کرنے لے جاتے، ڈھیر سے کھلونے دلاتے اس کا خوب لاڈ کرتے پھر ایک دم جی اکتا جاتا تو چپت مار کر بھگا دیتے۔ چابڑے شراب پیتے تھے اس لئے دادی بی نے ان کا چولہا الگ کر دیا۔

بدھیا ان کے لئے گوشت بھون کر پراٹھے تلتی اور آدھی رات تک بھوکی پیاسی ان کا انتظار کرتی اور جب وہ نشے میں چور رنڈی کے کوٹھے سے لوٹتے تو بھنا گوشت اور پراٹھے کھلا کر ان کے پیر دباتی چابڑے اس کی خدمت گزاری سے ذرا مرعوب نہ ہوتے اور ذرا

سی بات پر مار مار کر بھرتہ کر دیتے اور ایک دن وہی ہوا جس کا دادی بی کو ڈر تھا۔ محرم کے دن تھے چابڑے سارا دن شراب پی کر ڈھول پیٹتے رہے اور تعزیے اُٹھاتے رہے رات کو تھکے ہارے لوٹ رہے تھے کہ انہیں ایک ہاتھ رکشہ ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔ گلی سنسان تھی اور سواری دیوار سے لگی رکشا کی مرمت کا انتظار کر رہی تھی۔ برقعہ پوش عورت چابڑے کو دیکھ کر ایک دم دیوار سے پھسل کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے" چابڑے نے رکشا والے سے پوچھا۔

"حجور رکشا اُلٹ گئی" رکشا والا چابڑے کو جانتا تھا۔ نگران کے گھونسے کو بھی خوب پہچانتا تھا۔

"ابے یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں"

"حجور مرجاد مرزا صاحب کے گھر کی سواری ہے اب انہیں کیسے پہنچاؤں"

"کون سے مرزا صاحب"

"حجور مرتجا بیگ"

"ہیں... شدہ خانم" چابڑے نے گھٹے ہوئے گلے سے کہا اور ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ دو چار موٹی موٹی گالیاں رکشا اور اس کے مالک کو دیں اور پھر احمقوں کی طرح سر کھجانے لگے۔ ان کی زبان کو تالا لگ گیا۔

"حجور دوسرے رکشا آگے نکل گئے، بھیڑ میں پیچھے رہ گیا" چابڑے سر کھجاتے اور موہنہ ہی موہنہ میں گالیاں بکتے رہے۔ سوچنے لگے بھلا اس وقت سواری کہاں ملے گی کہ اتنے میں

ایک تانگہ میں دو آدمی جاتے دکھائی دیئے۔ چابڑے نے تانگہ رکوا کر ان سے کہا کہ "اترو"
وہ اینٹھنے لگے تو چابڑے نے دونوں کے سر پکڑ کر ٹکرا دیئے اور عمدہ خالہ سے کہا "چلو بیٹھو"
عمدہ خالہ بُری طرح لرزنے لگیں، اگر پاس کوئی کنواں کھائی ہوتی تو جان دے دیتیں۔
مگر آج تو موذی کے ہاتھوں عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔

"سیدھی طرح تانگہ میں بیٹھ جاؤ۔ میں کھا نہیں جاؤں گا۔ عمدہ خانم"۔ چابڑے گرجے۔
درود اور آیۃ الکرسی پڑھتی خالہ تانگے میں بیٹھیں۔ چچا ساتھ تانگے کے بم پکڑے چلے۔ جگہ
تھی پر خود نہ بیٹھے تانگہ میں۔

اور سارے راستے ان کے مونہہ کو لگا ہوا تالہ نہ کھلا اور عمدہ خالہ کے برقعے کی نقاب
آنسوؤں میں بھیگی رہی وہ ان کی ساری دھمکیاں سارے ڈراوے ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔
وہ تانگہ کے ساتھ بھاگ رہے تھے اور آنکھیں نیچی تھیں۔ مکان سے تھوڑی دور ان کے
قدم رُک گئے۔ جیب سے دو روپے نکال کر انہوں نے تانگے والے کو دیئے اور جب
خالہ اُتر کر ڈیوڑھی میں چلی گئیں تو چابڑے سر جھکائے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔
رات کو جب بڑھیا نے ان کے پیر دبانے چاہے تو انہوں نے اس کے ایک لات
رسید کی اور مونہہ موڑ کر پڑ رہے۔

بڑھیا مستقل شے بن کر چابڑے کی جان کو چمٹ گئی چابڑے نے وہ اُسے چار چوٹ کی
ماردی اور نکالنا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"چاہے میری بوٹیاں کاٹ ڈالو مرزا جی اَب میں اور کہیں کی تو رہی نہیں، ذات برادری

نے باہر کر دیا۔ تم نے میرا خرابا کیا ہے۔ چھاتی پر چڑھ کے خون پی جاؤں گی۔ پر اس جنم میں تو نہیں چھوڑوں گی" چابڑے سہم کر چپ ہو گئے۔

بدھیا کی اس دلبری کا ان پر رُعب پڑ گیا۔ کچھ عمر کا تقاضا، کچھ روپے کی ریل پیل میں کمی چابڑے اُسے جھیل گئے۔ بدھیا ان کی بیوی کی طرح خدمت کرتی۔ پھٹا پرانا پہنتی کبھی اُسے خیال بھی نہ آتا گھر کے بوڑھے بچے سب اُسے بدھیا کہتے۔ گھر کی بہو بیٹیوں سے دُور وہ ہمیشہ زمین پر ہی بیٹھتی۔ مگر اس کی خدمت گزاریوں میں کمی نہ آئی۔ چابڑے نے اسے مارنا بھی کم کر دیا۔ کبھی ایک آدھ جھاپڑ دھر دیتے۔ روپیہ پیسہ اسی کے ہاتھ میں رہتا۔ بڑی جھک جھک کے شام کے نشے کا خرچہ دیتی۔ چابڑے بگڑتے خفا ہوتے لیکن کچھ کر نہ پاتے۔ بلکہ اسے زیور بھی بنوا کر دینے شروع کئے اور زبردستی پہننے کو کہتے۔ اس کا لڑکا ایک فیکٹری میں نوکر ہو گیا تھا۔ چابڑے اُسے بہت چاہتے تھے۔ اپنا موروثی مکان اس کے نام کر دیا تھا۔ اور بالکل بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک دن جب بڑے ترنگ میں تھے۔ بدھیا نے دہی ڈال کر گوشت بھونا اور گرم گرم پراٹھے اتارے، چابڑے وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر چٹخارے لے کر کھانے لگے۔

"بھئی واہ کمال کر دیا بدھیا آج تو تو نے۔ بھئی واہ۔۔۔۔ کیا بوٹی گلائی ہے۔ تجھے تو انعام ملنا چاہیئے۔ بول کیا مانگتی ہے؟"

"جو مانگوں سو دو گے مرزا جی؟"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ وہ تیرے کنگن کل آجائیں گے"

"وہ تو بے کار بنوا دیئے۔"

"پھر کیا مانگتی ہے؟"

"مرزا جی مجھ سے نکاح کر لو۔" بڑھیا نے لجا کر کہا "بڑھاپے میں گناہ نہیں کیا جاتا۔"

"نکاح! گناہ!"

چابڑے کا مونہہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان کا سیاہ چہرہ تنور کی طرح دہک اٹھا۔ چولہے سے لکڑی کھینچ کر انہوں نے بدھیا بیگم کا پلیتھن کر دیا۔ اگر لوگ بھاگ کر بچا نہ لیتے تو شاید وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتے۔ "گناہ کی بچی۔۔۔ کہتی ہے نکاح کر لو سالی ہماری ہتک کرتی ہے ارے ہم نے اسی کمبخت کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ ہم نے اس کے لڑکے کو اپنا جائز وارث بنایا، فیکٹری میں نوکری دلوائی جو کچھ کمایا اسی کی ہتھیلی پر رکھا۔ تس پر بھی نکاح کی ضرورت ہے؟ ہمارے اوپر اعتبار نہیں قطامہ کو، ہم سے پکے کاغذ لکھوالی ہے۔"

مرتے مر گئی، پھر بدھیا نے نکاح کی تمنا نہ کی۔

وقت کی ندی اچھلتی کودتی بل کھاتی رہی، بہتی رہی۔ بڈھیا کے مرنے کے بعد چابڑے جیسے یتیم ہو گئے، کوئی ان کی دیکھ بھال بدھیا کی طرح کیسے کر سکتا۔

ننھے بچے کی طرح آنچل کی چھاؤں میں رکھتی تھی۔ ان کی گت بن گئی اور وہ ایک رشتہ دار کے دست و دوسرے کے در کی ٹھوکریں کھاتے لڑھکتے پڑھکتے ہماری کوٹھی کے سب سے سڑاندے کونے میں پہنچ کر وہیں بس گئے۔

چابڑے کی زندگی کے آخری دن کتنے ویران اور پیار محبت سے خالی تھے۔ کئی دن وہ

اکیلے کوٹھری میں پڑے دم توڑتے رہے۔ کبھی کوئی جھانک آتا۔ کون تھا جو دن رات ان کے سرہانے بیٹھتا پرانی یادوں کے جال میں اُلجھے چابڑے تڑپتے رہے، تلملاتے رہے۔

"عمدہ خانم سے کہلوا دو اب زیادہ انتظار کی سکت نہیں، اتنا نہ آزماؤ اب آ بھی جاؤ۔ حالانکہ عمدہ خالہ ان سے پانچ سال پہلے مر چکی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی دے کر آئے تھے۔

"بدھیا سے کہو یہ سارے دروازے کیوں بند کر دیئے .... دم گھٹ رہا ہے۔"

"دودھ جیسے پنڈے پر سرمئی جال گہرا ہوتا گیا ...."

کنکیا کٹ گئی اور ڈور لٹ گئی۔

⁂

چند تصویرِ بُتاں

"آئی ایم فیڈ اَپ" سوزی نے لمبی لمبی سڈول ٹانگیں کرسی پر ٹکا دیں اور سُرخی مائل سنہری زلفیں پشت پر جھٹک دیں۔ وہ اسی دن بیوٹی پارلر سے بال بلیچ کرا کے آئی تھی۔

"کیا ہوا، پھر کوئی پارسل چھڑانا ہے۔ بوسٹن سے آیا ہوگا۔"

نہیں۔ ریٹا ایک کُتیا ہے۔ جب سے بھیّا نے شادی کی ہے پارسلیں بند ہو گئیں۔

"پھر کیا مصیبت کھڑی ہو گئی؟"

مہا کنجوس ہیں ڈیڈی۔ کہتے ہیں سی سی آئی کا بل ہم لوگ بہت بڑھا رہے ہیں۔

برتھ ڈے کی پارٹی کیا دی مصیبت ہو گئی اور.....

"اور بھی کچھ؟"

"بیر کا بل نہیں چکائیں گے۔"

"اوہ ...."

"آنٹی اب کیا میں منع کر دیتی کہ بیر کی مناہی کر دی ہے پیا جی نے؟"

"سنا ہے کچھ برتن بھی ٹوٹے ــ"

"دو چار گلاس گر گئے۔ کوئی جان کے گرائے۔"

منوری کا نام سوشیلا ہے۔ مگر اتنا گھسا پٹا نام اس نے پچھلے فیشن کی تنگ قمیص کی طرح کبھی کا اتار پھینکا۔ صورت شکل کی بھی اچھی ہے۔ ذرا بھاری بھر کم ہے جلدی ماس چڑھ جاتا ہے۔ بیوٹی پارلر کا بل بھی چڑھ جاتا ہے۔ ممی کا قد بہت چھوٹا ہے مگر منوری باپ پر گئی ہے۔ گوشت کا دبال ممی کی طرف سے ملا ہے۔ سب سے بڑا ہومیش ہے ایک اور بیٹا پیدا کرنے کی دھن میں تلے اوپر پانچ بیٹیاں پیدا ہو گئیں۔ عاجز آکر تیواری جی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مونیش اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گیا تو وہیں ایک میم سے شادی کر کے وہیں کا ہو رہا۔ تیواری جی انکم ٹیکس کے محکمہ میں تھے تین سال ہوئے ریٹائر ہوئے۔ دو لڑکیوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی ابھی تین سلیں چھاتی پہ دھری ہیں۔ چھوٹی ابھی بارہ تیرہ برس کی ہے۔

سوزی جسے ہند کالج میں پڑھتی ہے کبھی تازہ دم ہونے آجاتی ہے۔ تیواری جی سی سی آئی کلب کے سامنے بلڈنگ میں رہتے ہیں۔ کبھی ڈنر پارٹیوں میں صاحب سلامت ہو جاتی تھی۔

سوزی بہت پاپولر ہے۔ کبھی دوستوں کو بھی لے آتی ہے۔ نوجوان طلباء سے بات

کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ کیا زندہ دل بچے ہیں۔ ٹرانزسسٹر پر پاپ میوزک بجا کر ادھم مچاتے ہیں۔ میرا کمرہ بند ہو تو پتہ بھی نہیں چلتا ڈرائینگ روم میں کیا ہو رہا ہے۔ سوزی بہت بدلتی رہتی ہے۔ ویسے مجھے نہ ان کے نام یاد رہتے ہیں نہ صورتیں کیونکہ سب ایک ہی فیشن کے بال رکھتے ہیں۔ آج کل امیتابھ چل رہا ہے یوں تو میرا نوکر بھی پاکٹ سائز امیتابھ لگنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب یہ لوگ جمع ہوتے ہیں تو ان کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ کبھی چاٹ چینی کھانا یا بیئر منگاتے ہیں تو بڑی مستعدی دکھاتا ہے۔ میرا کچھ خرچ نہیں ہوتا سوائے برف کے پانی کے اور نوکر کو ٹپ مل جاتا ہے تو میرا کیا جاتا ہے۔ نکی سوزی ٹینا ڈولی پمی نیپی شوکی لڑکوں لڑکیوں کے نام ہیں۔ جنہیں ان کی شخصیت پر چپکانے کی زحمت کو دلچسپی نہیں۔ سب دولت مندوں کے جگر گوشے ہیں۔ بس میں تو شکر ادا کرتی ہوں اللہ کا کہ میرے جگر گوشے نہیں۔ بڑی کنجوس ہوں۔

کیسے دریا دل ہیں ان کے والدین چار پانچ سو یعنی ایک بھلے آدمی کی تنخواہ تو پاکٹ منی دیتے ہیں۔ اس طرف شاید میں ہی سب سے غریب ہوں۔ سوائے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے موچی سگریٹ بیڑی والا، چاٹ والا اور پہرے والوں کے ان کی شاہ خرچی دیکھ کر بہت ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ آٹھ نو برس کی تھی تو ابا سے کم عہدے والوں کے ہاں پنشن کے بعد بھی وارے نیارے رہے اور ہم لوگوں پر پابندیاں طاری کر دی گئیں۔ سوزی ٹھیک کہتی ہے میں بھی اس کے پپا کی طرح کنجوس ہوں اس کی ممی تو اب بھی دو روپیہ پوائنٹ رمی کھیلتی ہے "مگر سوچو تو سوشیلا تمہارے پپا کی پنشن ہو گئی ہے۔ تمہارے بھیا کو

امریکہ سے پیسہ ہر سال آتا تھا۔ دو لڑکیوں کی شادی کی۔ جہیز دیکھ کر میرا سر تو چکرا گیا۔ اور وہ جو کسی نے نہ دیکھا چپکے سے داماد کو دیا اس کا تو حساب ہی نہیں۔ پھر اتنا بڑا فلیٹ۔ کتنی تنخواہ تھی تمہارے پپا کی! کیسے کیا آپ نے۔ ذرا آمدنی اور خرچ کا حساب لگاؤ۔ مانا کہ انکم ٹیکس والوں کی آمدنی خوب ہوتی ہے مگر ایک حد ہوتی ہے۔

”مگر پھر بھی آمدنی بہت ہے۔ کنجوسی نہ کریں تو.....“

”ابھی تم تین بہنوں کی میت اٹھانی ہے۔“ سوزی میت کے معنی نہیں جانتی۔ تھوڑی سی ہندی میٹرک تک پڑھی۔ مر گر کر نقل کر کے پاس ہو گئی۔ اس کے بعد ہندی سے واسطہ ہی نہیں۔ ساتھ مراہٹی بھی پڑھی تھی وہ تو نام چار کو بھی کیسے یاد رہتی۔ پھر کام تو بس انگلش سے پڑتا ہے۔ دولہا کانونیٹ کی پڑھی لڑکی مانگتا ہے۔ یہ دیسی زبانیں تو غریب طبقہ کے لئے ہوتی ہیں۔ اوپر والے تو انگریزی ہی سے ناڈ پار لگاتے ہیں۔“ مدہے سوری تمہارے پپا کو ایک عدد ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ چالیس برس نوکری کی۔ کولہو کا بیل بنا ڈالا ہے۔ تم کمبختوں نے۔ ذرا سوچو تم چھ کتنے مہنگے پڑتے ہو۔ تیواری جی کو اور پھر تمہاری ممی بھی کچھ سستی نہیں۔ اگر بے چارے کی اوپر سے آمدنی نہ ہوتی تو بھیک مانگتے پنشن کے بعد۔

”آنٹی آپ تو جی جلا رہی ہیں اوپر سے۔“

”اور پھر تم تینوں کا جہیز۔ مر جائے گا بے چارا تیواری۔“

”کمبخت لڑکے مانگتے ہیں جہیز۔ ویسے اچھا لڑکا کہاں ملتا ہے یہ جہیز کیوں مانگتے ہیں کمبخت؟“

”اچھا لڑکا بس لکھ پتی ہوتا ہے۔ جانتی ہو وہ کتنا مہنگا پلتا ہے۔ کیوں نہ مانگے گا جہیز!“

"آخر تمہیں رکھے گا، شادی کے بعد تو اور خرچ بڑھیں گے تمہارے۔" کیا خرچ کرتی ہوں اتنا بہت؟ درما جی کی لڑکیاں کتنا خرچ کرتی ہیں اور لڑکے تو ہم سے دوگنا خرچتے ہیں۔ سونی صاحب کے لڑکے پیپری کو ایک ہزار پاکٹ منی ملتی ہے۔ تین کلبوں کا کارڈ ہے کیا پارٹیاں دیتا ہے۔ اپنی کار ہے۔ ریس میں الگ مارتا ہے۔ ہی از سو ہینڈسم آنٹی۔ فلم بنانے کی سوچ رہا ہے خود۔ نیکسٹ امیر لونا انسٹی ٹیوٹ جا رہا ہے۔"

"اس کا باپ فلم ڈسٹری بیوٹر ہے۔ اس کا کیا مقابلہ کرنا۔"

"پاگل ہے میرے پیچھے۔"

بس پھر کیا ہے۔ مزے ہوں گے تمہارے۔ مگر اس دن تو پدمنی شولاپور۔

"کولہاپور....."

"سوری کولہاپور کا ذکر کئے جا رہا تھا۔

"ارے وہ آتی ہے۔ اس کے چکر میں اس کی ماں اتنی کوک ہے کہ بس.....

"ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھیے؟"

"تمہاری ممی جہیز لائی تھیں۔"

"ایسا ویسا۔ دو لاکھ کیش۔"

"تیس سال پہلے؟"

"جی، اور ایک پٹرول پمپ دادر میں ایک کلابہ میں۔ اور چالیس تولہ سونا پانچ سیٹ

زیور ایک ہیرے کا۔

"کتنی بہنیں تھیں۔"

"تین، ناناجی دیوان تھے۔ بیلاپور کے نوکری بھی دلوائی انہیں نے۔"

"چھوٹی سی جاگیر کہو.... پھر بھی...."

"چھوٹی سہی پارٹی.... تین حویلیاں تھیں۔ پہلے بڑی موسی جی کی بات چلی تھی۔ چھ لاکھ اور.... ممی سے دوگنا، مگر پپاجی اکڑ گئے۔"

"کیوں ـ؟"

"چیچک میں ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔"

"بھئی واہ انکار کیوں کہہ دیتے دوسری آنکھ بھی پھوڑ دو اور بارہ لاکھ اور وغیرہ وغیرہ منظور...."

ٹیڑے آنٹی.... سوزی ہنسنے لگی۔

"اچھا بیری کتنے بن پڑے گا پپاجی کو۔"

"ارے باپ فلیٹ بیچنا پڑے گا پیڈر روڈ والا۔ اٹھارہ لاکھ لگ رہے تھے اب تو دوگنے ملیں گے۔"

"مگر اس کا کرایہ جو بلیک میں لیتے ہیں بند ہو جائے گا۔"

"ہو جائے گا تو...."

"بیری سے کہو جہیز نہ لے۔"

"واہ واہ، کیوں کہوں؟"

"حلیہ ٹائٹ ہو جائے گا تمہارا۔ پاپا کا ابھی دو لڑکیاں اور بھگتنی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں، اپنا حق نہ لوں۔"

"ہوں۔ یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔ تمہارا حق! کیوں کہ تم نے اپنے باپ کے گھر جنم لینے کی زحمت اٹھائی۔ انہیں اپنے پچھلے جنم کا بھگتان بھی کرنا ہے۔"

"یہ سب اس چڑیل کی وجہ سے ہوا۔"

"کون چڑیل۔"

"جس نے بھیا کو پھانس لیا۔"

"اوہ....."

بھیا کو اتنا جہیز ملتا کہ ہم دو بہنوں کو آرام سے بیاہ سکتے تھے

تو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بے چارے کو پاپا نے بہت لکھا کہ اس سے پیچھا چھڑالو تو اب بھی ہے پپا۔ جب پتہ چلا تھا تبھی

کچھ نہیں گیا ہے۔ امریکہ ریٹرن کی بڑی ڈ... بیوی ہے۔ مرتی بھی نہیں چڑیل تو۔ اور نہ طلاق لیتی ہے۔

حالانکہ امریکہ میں تو خوب فیشن ہے طلاق کا۔"

وہ کمبخت... جیو ہے۔ یہ جیو بڑے چکو ہوتے ہیں۔ اور دھڑا دھڑ بچے دیتے ہیں۔ اپنی

تعداد بڑھانے کو۔ ایک لڑکی تو شادی کے چار مہینے بعد ہی پیدا ہو گی۔ دوسرا لڑکا سال بھر کا بھی

نہیں کہ پھر تیاری کر رہی ہے اور ممی تو جانے کی ضد لگا رہی ہیں۔

"جاتیں کیوں نہیں۔"

"اور جھگڑا اٹھتا ہے پپا ایک کنجوس۔ کہتے ہیں لوتی پوتا کو دیکھتے نہیں وہاں سے سڑھیاں اور میک اپ لینے جا رہی ہو۔ ارے کیا یہاں دنیا بھر کا سامان نہیں ملتا جو ممادہاں جائیں گی۔"

"سنا تھا کچھ پالیٹیکس میں دلچسپی لے رہے تھے۔"

جنتا میں خاصے جم گئے تھے پپا۔ بہت سے دوستوں نے زور ڈالا تھا۔ مگر جنتا ہی اُلٹ گئی۔

"تو کانگریس میں چلے جائیں۔"

ارے کانگریس میں تو دنیا بھر کا کوڑا بھرا ہے کب کسی کو موقع ملتا ہے۔ جنتا میں اتنی بات تو ہے بڑے سیٹھ بیکنگ کر ہیں۔ پبلسٹی اچھی ملتی ہے۔ کانگریس میں تو چانس ملنا مشکل ہے۔ پر کیا فرق پڑتا ہے پپا دانت سے پیسہ پکڑتے ہیں۔

افوہ اس اولاد کی خاطر مردوں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ چوری غبن اسمگلنگ، پتہ بازی۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔

زیادتی کیا ہے؟ سوزی نے منہ پھیلا لیا۔

"تم لوگ کتنا خرچ کرتی ہو! کھانا کپڑا، نوکر، پھر میک اپ فیشن اور دو دو شو سینما کے کلب ریسٹوران کے بل، توبہ، انسان چوری نہ کرے۔ پتہ بازی نہ کرے تو کیسے جیئے۔

سوزی چڑ گئی۔ میرا بھی جی جل رہا تھا۔

"تم لوگوں کو پپا کی بیماری کا خیال بھی نہیں بس پیسہ بنانے کی مشین سمجھ رکھا ہے۔ کم

سے کم میک اپ سینما تفریح کا بوجھ تو نہ ڈالو۔ مگر ایسا ہی شوق ہے۔ تو خود کم سے کم اپنے سنگھار اور عیاشی کا خرچ تو خود کماؤ۔

کالج چھوڑ دیں اور نوکری ....

نہ کالج چھوڑ کر نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی ٹیوشن کر سکتی ہو۔

"ٹیوشن" ! سوزی ایسے چونگی جیسے میں نے اس کے سر پر لٹھ مار دیا ہو۔

"بالکل، یا پارٹ ٹائم کسی دفتر میں کسی کمپنی میں دو چار گھنٹے تو لگا سکتی ہے پھر چھٹیوں میں کچھ کما سکتی ہو۔ ویسے تو بڑی دلائتی بنتی ہو مگر ولائتی عورت کی طرح محنت سے کتراتی ہو۔

"مگر وہ تو حد سے زیادہ فیشن کرتی ہیں"

ان کے ماں باپ کے بل بوتے پر نہیں اسکول کے بعد کالج کے خرچ کے لئے ہوٹلوں میں دفتروں میں اسٹورس میں کام کرتی ہیں۔

"وہ تو بڑی جلدی شادی کر لیتی ہیں۔ اور پھٹ طلاق"

جس طرح تمہارے ماں باپ نے زندگی گزاری ہے یا جیسی تمہاری بڑی بہن زندہ ہے اس ذلت سے تو طلاق بہتر ہے۔ مگر تمہارے طبقہ کی عورتوں کو کسی بات کا احساس نہیں اگر تمہارے پپا غریب ہوتے تو ممّا جھٹ چھوڑ کے گھر بیٹھ جائیں مگر جی بہلتا رہے تو سب اشت کر لیتی ہیں۔ بلکہ اپنے میاں کی داشتہ سے بھی دوستی ہے"

تو دکھاوے کی دوستی ہے۔ سوسائٹی میں منہ دکھانے کے لئے ممی کا بس

ہے چاری کو ممی۔ ارے بیچ۔

دکھادا۔ بس زندگی سونا پور کی دیوار پر اشتہار کے سوا کچھ نہیں۔ تم اپنی ماں کو کُتیا سمجھتی ہو وہ تمہیں پلّا سمجھتی ہیں۔

او کے آنٹی کتنے بور ہیں، ہم لوگ میں تو سمجھتی تھی آپ بڑی برو ڈ مائینڈڈ ہیں۔ لڑکیوں کے فیشن کے خلاف نہیں ہوں گی۔ آخر لڑکیوں پر خرچ ہوتا ہے کہ نہیں۔

سوال لڑکے لڑکی کا نہیں۔ اولاد کا ہے۔ لڑکے کچھ پیسہ اڑاتے ہیں شوق سے اڑائیں۔ مگر ماں باپ کے روپیہ سے نہیں۔ اتنے سیر سپاٹے کرتے ہیں یورپ کی نقل کرتے ہیں کھانے میں ان کی نقل سے ناک کٹتی ہے۔ بچوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلانا قدم جمانے میں مدد کرنا، والدین کا فرض ہے مگر سینما دکھانا وہ بھی بلیک سے پچاس پچاس کے ٹکٹ خرید کر امریکہ سے چین، نیویارک سے پل اور جرمنی سے کیمرے فرانس سے سینٹ منگوانا اور ان کے ہاتھ قلم کرنا ذہن کچلنا، رشوت، بے ایمانی، جعل سازی پر تیار کر دینا حرام خوری ہے۔

او کے بائی.... سوزی تنہائی ہوئی دروازہ دھڑاکے سے بند کر کے چلی گئی۔

پھر وہ کبھی نہیں آئی۔

مگر وہ بمبئی ہی میں ہے۔ اور بڑے ٹھاٹ سے چار بیڈ روم کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ اس نے بی اے کا امتحان نہیں دیا۔ بیچ ہی میں ایک پارٹی کے ساتھ گوا چلی گئی۔ پھر کشمیر اور کنیا کماری۔ چھلانگیں لگاتی وہ واپس بمبئی لوٹ آئی اور اپنے باپ کے ایک دوست سے مرتا کا معاہدہ کر کے پیڈر روڈ پر رہتی ہے۔ سیٹھ دنیا بھر کے دھندے کرتا ہے۔ اور سوزی کے پپا اس کے انکم ٹیکس ایڈورٹائزر بن گئے ہیں۔ سیٹھ تو پہلے پھولے ہی

تیواری جی نے بھی چوتھی بیٹی کی بڑے شاندار طریقے سے شادی رچائی۔ آخری لڑکی بہت لاڈلی تھی۔ وہ رجنیش بھگوان کے سہارے نروان حاصل کرنے پر جٹ گئی۔ بس رکمنی تیواری سے مارکنی بن گئی ہے۔ آجکل امریکہ میں ہے۔ تیواری جی اس کے نہایت شکرگزار ہیں۔ کہ جہیز کے چکر سے چھوٹ گئے۔ ان کی گرل فرینڈ نے ایک عرب بھائی سے نکاح پڑھالیا اور شارجہ چلی گئیں۔

تیواری جی شدید قسم کے پولیٹیکل سے ہو گئے ہیں۔ بہت سے جلسوں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ ایم۔ پی بنتے بنتے رہ جاتے اور دنیا کے دکھوں کا ذمہ دار مسز اندرا گاندھی کو گردانتے ہیں۔

مسز تیواری اس نکتہ پر سونی صدی پتی دیو کی ہم خیال ہیں اور دنیا کی سیاست پر بڑے دقیقی جملے دہراتی ہیں۔ بے حد الجھ جاتی ہیں۔ اکثر کسی پارٹی میں مل جاتی ہیں۔ رونالڈ ریگن کی بچپن سے فین ہیں وہ انہیں پیار سے رونی کہتی ہیں اور ایسے ذکر کرتی ہیں جیسے ان کی عزیز ترین پڑوسن ہیں۔ روس سے بہت خفا رہتی ہیں اور افغانستان اور پولینڈ کے چشم دید قسم کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ کیوں کہ انہیں میرے روس جانے کا علم ہے اس لئے مجھے روسی مظالم میں ملوث سمجھتی ہیں۔

اے ہے آپ روس کو منع کیوں نہیں کرتیں کیا اندھیری مچا رکھا ہے۔

جی بس یہ سموسہ ختم کرلوں ابھی روس کو پھٹکارتی ہوں۔

آخر سوتنتر کیوں نہیں کرتا افغانستان کو۔

"یہ بھی پوچھوں گی۔"

پھر اپنی دانست میں وہ میری دکھتی رگ پر وار کرتی ہیں۔

"بھئی سورت جانی کو یہ منسٹریاں وغیرہ نہیں۔ عورت کی جگہ تو گھر ہے۔ انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا مگر میں سمجھ گئی کہ اینٹا کس طرف پھینکا ہے۔ میں نے فوراً لپک لیا۔ جی اب کے ملوں گی تو ان سے کہوں گی چھوڑو کیا پرائم منسٹرین، جان کھپا رہی ہو بیوی۔ چین سے گھرداری کرو۔ ارے بھئی وہ چاہیں تو راشٹرپتی بھون میں کئی پارٹیاں رچا سکتی ہیں۔

بیویاں کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔ مسز تیواری گڑگڑاہٹ میں جو کر پھینک جاتی ہیں۔ اور میری طرف ایسے قہرآلود نظروں سے دیکھتی ہیں جیسے میں نے ہی اس کو ورغلایا ہے اور مسز گاندھی کو بھڑکا کر پرائم منسٹر بننے پر آمادہ کر دیا ہے۔

میں انہیں ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ میں نے انہیں ایک بار فرلانگ بھر کے فاصلے سے دیکھا تھا۔ اور میری آنکھیں بہت کمزور ہیں۔

کہ میری سورت جانی کو ورغلانے والی تصویر دھندلی پڑ جائے گی۔

چراغ روشن ہیں

تیسرے درجہ کے ڈبہ میں غضب کی بھیڑ تھی۔ ریل بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے کہانی پڑھنے کے لئے بلاوا آیا تھا۔ اور میں جودھپور سے دہلی جا رہی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کو تار دے دیا تھا۔ وہ مجھے اسٹیشن پر لینے آگئے۔

ریڈیو اسٹیشن کا کافی رعب تھا۔ یہاں کرشن چندر سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی ویسے ملاقات تو زندگی کے موڑ پر ہو چکی تھی۔ میں نے اس وقت بس دو چار کہانیاں لکھی تھیں۔ کرشن کی میرے دل میں بڑی قدر تھی۔ چند نئے لکھنے والوں میں ان کی حیثیت بڑی نمایاں تھی۔ منٹو اور بیدی سے بھی روحانی ملاقات تھی۔

کرشن کو یوں سامنے جیتا جاگتا دیکھ کر دل میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ اس وقت کسی گرین سوٹ اور سرخ ٹائی میں بے طرح جچ رہے تھے۔ چھوٹے قد کے باوجود خاصے ہینڈسم

لگ رہے تھے۔ تب ان کے سر پر پورے گھنے بال تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں کبھی یوں سجا نہیں دیکھا۔ جب بمبئی میں دوسری بار ملاقات ہوئی تھی تو گنجے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہلکی سی قمیض اور یوں ہی سی پتلون میں کچھ کھوئے سے اکتائے ہوئے بیٹھے تھے۔ منٹو کے گھر میں چند لوگ جمع ہو کر پی رہے تھے۔ منٹو کی زبان سے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ بار بار کرشن کو باتوں کے سلسلے میں گھسیٹتا۔ مگر کرشن کچھ پھیکے سے نہایت مختصر جواب دے دیتے۔ پھر وہ پنجابی میں کچھ فوں فاں شروع کر دیتا مگر کرشن جیسے اسے بچہ سمجھ کر ٹال رہے تھے۔ وہ ہولے سے مسکراتے اور ان کی حساس آنکھیں دور خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگتیں۔

جب باوجود روکنے کے کرشن اٹھ کر چلے گئے تو منٹو بڑی دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ مجھ سے اُلجھ پڑا کہ کرشن سے مرعوب کیوں ہوں۔

"منٹو میں اور تم غلاظت کے ڈھیر کریدتے ہیں اور گند اُچھالتے ہیں، کرشن کا قلم باریک سوئی کی طرح بیل بوٹے سنوارتا ہے۔" میں نے منٹو کو چھیڑا اور وہ لڑ پڑا مگر تھوڑی دیر کے بعد کچھ سمجھ سا گیا۔

"انسان کی زندگی میں جو محرومیاں ہیں ان کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کرتا ہے۔" منٹو خود ہی قائل ہو کر بولا۔ ہم بڑی دیر تک کرشن پر بحث کرتے رہے۔ اور قائل ہو گئے کہ مختلف ہوتے ہوئے بھی کرشن سے دماغ کا کوئی حصہ بے طرح متاثر ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی اس کی تحریر میں یہ ہے کہ ایک جال سا بُن دیتا ہے۔ جس میں پھنس کر انسان ان راہوں پر سوچنے لگتا ہے جن راہوں پر کرشن چل رہا ہو۔

"ان داتا" پڑھ کر میرے دل میں کرشن کی دہشت بیٹھ گئی۔ ایسا لگا۔ کوئی تحریر نہیں فلم دیکھ رہی ہوں۔ منٹو سے میری بڑی لڑائی ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ میں اسے جلانے کے لئے بار بار "ان داتا" کو پکڑ لاتی ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے بنگال کے قحط کو صرف "ان داتا" کی عینک لگا کر دیکھا۔

چھیالیس سینتالیس کے اِدھر اُدھر ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ سب ہی لکھ رہے تھے۔ مگر کرشن چندر کا قلم تلا نچھیں بھر رہا تھا۔ انہوں نے دو فلمیں بھی بنائیں۔ ان میں بھی اپنے خیالات کی عکاسی کی کوشش کی۔ چلنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس وقت ایسی فلموں کی کوئی وقعت بھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اگر سرائے کے باہر" راکھ اور دھرتی کے لال" جیسی فلمیں بنی ہیں تو ہٹ نہ ہوتے ہوئے بھی سراہی جاتی ہیں۔ مگر اس وقت تو ایسا معلوم تھا کرشن وقت اور پیسے کی بربادی کر رہے ہیں۔ پھر بھی ان کے قلم کو پر لگ چکے ہیں۔ وہ انوکھی ہمتوں میں اڑانیں بھر رہا تھا۔ لکھنے والوں کا جو گروہ ادب پر چھایا ہوا تھا۔ ان میں کرشن کا قد سب سے بلند تھا۔ اس زمانے میں ترقی پسند بڑے زور و شور سے میٹنگیں کرتے تھے۔ کرشن بھی ان میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے ان کے بال اور جھڑ چکے تھے۔ کپڑے عموماً خاموش نظر آتے تھے۔ بس ان کا قلم بول رہا تھا۔

پھر ملک تقسیم ہوا۔ کرشن کا قلم لہو لہان ہو کر خون اُگلنے لگا۔ وہ فساد کے مارے شرنارتھیوں میں گھل مل کر ان کے خونِ دل سے روشنائی کا کام لیتے۔ قصداً یا شاید انجانے میں انہوں نے بھڑکے ہوئے شعلوں پر پانی چھڑکا۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر نہ جانے کتنے دلوں سے نفرت اور خونریزی کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا

کرشن چندر پر مضمون تو لکھنے بیٹھ گئی ہوں مگر یادوں کی ایک یلغار ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں۔ ادیب کو اس کی زندگی اس کے دوستوں اور اس کے ماحول سے کیسے الگ کر لوں۔

دوسرے اگر میں چاہوں بھی کہ صرف ان کی تخلیقات پر قلم اٹھاؤں تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ یہ تو کسی نقاد کا کام ہے۔ میں تو کرشن کو ایک پیارا دوست ایک حساس انسان کی طرح جانتی پہچانتی ہوں وہ انسان پہلے تھے۔ ادیب بعد میں ہوئے۔

کوئی زور شور کی میٹنگ میرے گھر میں چل رہی تھی۔ کرشن کی غیر موجودگی بری طرح کھٹک رہی تھی۔ کرشن داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ پہلی بار ان کی بیوی بھی تھیں۔ پہلی بار کرشن دیر سے آئے اور "دیر کی وجہ" منہ پھلائے نہایت قہر آلود نظروں سے چاروں طرف دیکھتی رہیں۔ پھر پلٹ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ کرشن کی آنکھوں میں کرب جھلکنے لگا۔ اندر اور باہر کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے۔ مگر ہم نے جلدی سے دونوں کو پکڑ کر بٹھا دیا۔ کرشن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بیٹھ گئے۔

جب میٹنگ ختم ہوئی تو دونوں غائب تھے۔ نہ جانے کب سٹک گئے۔

"ضرور دونوں میں لڑائی ہوئی ہوگی" میں جو لڑنے میں مشتاق ہوں فوراً تاڑ گئی۔

"کہیں اور جانا ہوگا!" عباس نے رائے دی۔

"بے چاری بور ہو رہی ہوں گی" شاہد نے پہچان لیا۔

دوسرے دن کرشن آئے تو ہم ان کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ کرشن گم سم رہ گئے ان کی حساس آنکھیں کچھ دھندلی سی ہو گئیں۔

"اور کھانا بھی تمہارے یہاں کھائیں گے۔" شاہد نے زور دیا۔

"ضرور!" کرشن نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور جلدی سے عباس کی طرف چلے گئے۔

"جانا ٹھیک نہیں!" شاہد نے کہا۔

"کیوں؟"

"پتہ نہیں کیا بات ہے، کرشن اکھڑے اکھڑے لگ رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں بیوی سے لڑائی ہو گئی ہو گی۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

"مگر ہمارے ہی سامنے نہیں لڑیں گے۔ چلو اسی بہانے ملاپ ہو جائے گا۔"

ہمارے یہاں یہی حال تھا۔ زور شور کی لڑائی ہو رہی ہوتی۔ کوئی مہمان آجاتا، ہم دونوں فوراً چولا بدل کر نہایت خوش اخلاق بن جاتے اور یہ تک بھول جاتے کہ کس بات پر لڑائی ہو رہی تھی۔ فوراً تاش شروع ہو جاتی یا مہمانوں کو لیکر کسی ہوٹل میں محفل جم جاتی۔ ہم نے سوچا چلو کرشن کی لڑائی ختم کروادیں۔

کرشن اس زمانے میں ورسوڈیں ایک اجڑے ہوئے لق و دق مکان میں رہتے تھے۔ ہم ایک بڑے سے ڈھنڈار ہال میں پہنچے۔ کمرے کے بیچوں ایک ٹوٹا ہوا صوفہ پڑا تھا۔ دیوار سے لگی دو لمبی لمبی چارپائیاں کھڑی تھیں۔ صوفہ پر دو میلی کچیلی لڑکیاں ایک دوسرے کے بال کھسوٹ رہی تھیں۔ ایک بچہ ایک اونچی سی قمیص پہنے لکڑی سے دونوں کو پیٹ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بچے سکتے میں رہ گئے۔ ہم نے بہت پکارا بات تو سنو مگر بچے روتے بسورتے سرپٹ بھاگے چھوٹے

بچے کی تو گھگی بندھ گئی۔ جیسے اس نے کوئی ہوا دیکھ لیا ہو۔

ہم نے صوفہ سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک اسپرنگ سانپ کی طرح پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بھئی کوئی ہے؟" شاید نے ہانک لگائی۔"

بائیں جانب کے دروازے سے کرشن نکلے۔ اور دہلیز پر کھڑے ہو کر کھجانے لگے۔ پھر بولے۔

"ارے!"

جی جل کر خاک ہو گیا۔

"ارے بھئی ہم آئے ہیں!" ہم نے معذرت کی۔

دائیں جانب ایک دروازہ کھلا اور مہندر ناتھ ظاہر ہوئے۔

"اوہو۔ انہوں نے پٹاکر کہا۔"

ہم چاروں تھوڑی دیر احمقوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

"اِدھر آجاؤ۔" کرشن نے ایک دم فیصلہ کیا اور ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ نہایت چھوٹا مگر بڑا صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اس کھنڈر میں وہ کمرہ نگینہ کی طرح جگمگا رہا تھا۔ مختصر سا پلنگ، معمولی سا زمین پر فرش معلوم ہو رہا تھا۔ کسی زمانہ میں غسلخانہ ہوا کرتا تھا۔ کرشن نے اسے اپنا مکنے کا کمرہ بنا لیا۔ ہم نے زیادہ وقت اسی میں گذارا ذرا بھی تنگی یا اُلجھن نہیں محسوس ہوئی۔ کرشن کا وجود خود ایک وسعت تھا۔

"بیگم کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اِدھر ہوں گی" کرشن نے ٹال دیا۔

کچھ ہم ایسے صبح تڑکے بھی نہیں آئے تھے۔ نہ بے اطلاع آئے تھے۔ بارہ بجنے والے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا قصہ ہے۔ کرشن اور جیندر ناتھ کچھ بے چین سے تھے۔

"چلیں" شاہد نے چپکے سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، اماں یار بیٹھو بھی۔"

پھر زبانیں کھل گئیں۔ دل کھل گئے، ساری گھٹن مٹ گئی، مختلف کہانیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ منٹو کی یاد ستانے لگی۔ میں پلنگ پر لیٹ گئی۔ شاہد فرش پر پھسکڑا مار کر گپیں بنا بنا کر بانٹنے لگے۔ جیندر ناتھ میز پر پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ کرشن کرسی پر ایک پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ وقت اڑ رہا تھا۔

"ارے!" میں تو باتوں کے سلسلہ کو توڑ کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟ کرشن چونکے۔"

"تمہاری بیوی!"

"اوہ انہوں نے دوسرا پیر بھی کرسی پر جما لیا۔"

"کہاں ہیں؟"

"اِدھر ہوں گی!" کرشن نے ٹالا۔

"اِدھر کدھر؟" انہیں شاید ہمارے آنے کا پتہ بھی نہیں، کیا سوچیں گی۔"

سوچنے کے لفظ پر کرشن مسکرائے۔ جیندر ناتھ کھنکارنے لگے۔

"میں جا کر انہیں ڈھونڈتی ہوں" میں نے ہال میں جھانکا کوئی نہ تھا۔ برآمدے میں کوئی نہ

تھا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یا خدا یہ بچے کہاں گئے؟ سیڑھیوں سے اُتر کر میں نے بنگلے کا چکر لگانا شروع کیا۔ کچھواڑے کے چبوترے پر وہ کھڑی کپڑے پھیلا رہی تھیں۔ انہوں نے میرے آر پار دیکھا اور کپڑے پھیلاتی رہیں۔

"نمستے!" میں نے نہایت ڈھٹائی سے قریب جا کر کہا۔

انہوں نے سر کی جنبش سے میرا سلام وصول کیا اور سیڑھیاں اُتر کے غائب ہو گئیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا قصہ ہے کس بات پہ خفا ہیں۔ میں واپس کرشن کے کمرے میں لوٹ آئی۔

"ملیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"ملیں تو نہیں۔ دکھائی مزدوریں پھر غائب ہو گئیں۔ فلم "محل" کی ہیروئن کی طرح۔"

"اوہ!" کرشن سر کھجانے لگے، بڑے انہماک سے۔

"کوئی بات نہیں پھر مل جائیں گی، آپ اتنی پریشان کیوں ہیں!"

"کیا کچھ ہم سے خفا ہیں؟"

کرشن باہر گئے تو مہندر نے چپکے سے کہا "وہ دنیا سے خفا ہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ دنیا کرشن جی کو چاہتی ہے۔"

"وہ خود بھی تو کرشن جی کو چاہتی ہوں گی۔"

"اسی لئے تو وہ سمجھتی ہیں کہ دنیا کی ہر لڑکی کرشن جی پر مرتی ہے۔ اور ان کی سوت ہے۔"

"اے ہے بے چاری بڑی بھولی ہیں۔"

عورت کا میاں ہوتا ہے، بچے ہوتے ہیں۔ اگر میاں کا بٹوارہ ہو جائے تو وہ مہم جاتی ہے۔ خود اس کی ذات میں اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بٹوارے سے بھی خائف ہو جاتی ہے۔ میاں اگر عوام کی جاگیر بن جائے اور بچے بڑے ہو جائیں تو وہ خالی ہاتھ رہ جاتی ہے۔ اس دن کے لئے وہ ترستی رہتی ہے۔ خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ جو بھی حصہ بٹانے آتا ہے۔ اس سے سوتیا ڈاہ پیدا ہو جاتا ہے۔

"کرشن ڈیڑھ بج رہا ہے!" شاہد بولے۔

"نہیں ابھی تین منٹ باقی ہیں۔" کرشن گھڑی دیکھ کر بولے "کیا بھوک لگ رہی ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے جھوٹ بولا۔ اتنے میں اور بیرا آگئی۔ باتیں چل نکلیں۔ معلوم ہوا بیدی بھی آجکل یہیں ہیں۔ اور قریب ہی رہتے ہیں۔ ہم نے سوچا چلو بیدی سے مل آئیں۔ کھانا تیار ہوتا نظر نہیں آتا۔ کرشن سے پتہ پوچھ کر بیدی کے یہاں پہنچے۔

"سنا ہے بڑی گندی کہانیاں لکھتی ہو!" بیدی کی بیوی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"لکھتی تو بڑی صاف ستھری ہیں پر نہ جانے کیسے گندی ہو جاتی ہیں۔"

"مت لکھا کرو جی!"

"تم کہتی ہو تو نہیں لکھوں گی۔" میں نے بات ٹالی۔ کرشن کی بیوی کا ذکر کیا۔

"ارے وہ تو میری چھوٹی بہن ہے میں اسے بیاہ کر لائی ہوں۔"

"تو چلو مجھے ان سے ملوا دو۔ کھانا بھی وہیں کھا لیں۔"

"کھانا تو ہم کھا چکے ہیں۔"

"تو چلو۔"

بیدی کی بیوی نے چھوٹتے ہی انہیں پنجابی میں میٹھی میٹھی گالیاں دیں۔ ان کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ واقعی مسکرانے لگیں۔ فوراً اپنے کمرے میں لے گئیں۔ دروازے پر من بھر کا تالا پڑا تھا، اندر تین پلنگ گچ مچ بچھے ہوئے تھے جن پر نہایت میلا گودڑ پھیلا ہوا تھا۔ سب کھڑکیاں ٹھوس تھیں۔ ایک بھی شیشہ نہ تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تلے اوپر بہت سے صندوق رکھے تھے جن میں بڑے بڑے تالے لٹک رہے تھے۔ کمرہ دکھا کر فوراً باہر نکل آئیں اور تالا ڈال دیا۔

"کھانا آ گیا!" انہوں نے پہلا اور آخری جملہ بولا اور ہمیں چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔

مسز بیدی پنجابی میں خوب بڑبڑائیں۔

کھانا کرشن کے کمرے ہی میں لگ گیا۔ کسی اچھے ہوٹل سے آیا تھا۔ مرغ، شامی کباب، بریانی اور پڈنگ۔

"بیوی کو نہیں بلاؤ گے؟" میں نے کرشن سے پوچھا۔

"انہوں نے بچوں کے ساتھ کھا لیا۔"

"تو یہ تھی میری کرشن کی بیوی سے ملاقات۔ وہ نہ گونگی تھیں نہ بہری۔ مگر نہ جانے زندگی کے کون سے تاریک دور سے گزر رہی تھیں۔ وہ کسی سے نہیں ملتی تھیں۔ کہیں نہیں جاتی تھیں۔ ایک خود ساختہ قید بھگت رہی تھیں۔ وہ جاہل نہیں بی۔ اے پاس تھیں۔

دوسرے دن کرشن چندر آئے ان کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں پریاں ناچ رہی تھیں۔ بڑے خوش تھے۔ جیسے میری فاختہ اڑا دی ہو۔

"کیا لگا تمہارے گھر کی؟" میں نے جل کر کہا۔

"شامی کباب کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"تمہیں گھٹن نہیں ہوتی؟"

"لیکن اگر گلاوٹ کے کباب ہیں۔ تو تھوڑی پودنے کی چٹنی پسوا لینا۔"

"بڑے ڈھیٹ ہو!"

"تب ہی تو زندہ ہوں۔"

بہت دن تک کرشن غائب ہے میٹنگیں وغیرہ بند تھیں۔ ایک دن اچانک آگئے۔ آتے ہی صوفے پر ڈھے گئے۔

لال آنکھیں ماتھے پر زخم، ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی۔

"بس میں چکر آنے لگے۔ اس لئے یہاں اتر گیا۔"

"یار تجھے تو بخار ہے!" شاہد نے ماتھا چھو کر کہا۔ دیوان پر لٹا دیا۔ میں نے رضائی لا کر اڑا دی۔ تھرمامیٹر لگایا تو ایک سو چار ڈگری بخار!

"کیا کہیں گر پڑے؟"

"عرصہ ہوا ٹھوکر کھائے۔"

"چوٹ؟"

"یہ چوٹیں اکثر ابھرتی رہتی ہیں۔"

"سونے دو بے چارے کو۔" شاہد نے پردے کھینچ دیئے۔

آنسو میری کنپٹیوں میں ابلے جھلتے رہے۔ مجھے غصہ آرہا تھا، نہ جانے کس پر!

ان دنوں کرشن بڑے زناٹے سے لکھ رہے تھے۔ ہر رسالہ میں ان کی کہانیاں چھپ رہی تھیں۔ اردو کے بیشتر رسالے پاکستان کی طرف کٹ گئے تھے۔ یہاں کے رسالے دم توڑ رہے تھے۔ کرشن نے "شمع" اور "بیسویں صدی" میں بڑی پابندی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

شام کو دیکھا تو بخار نارمل سے بھی نیچے تھا کرشن گھر جانے پر مصر تھے۔ ہم لوگ کہہ رہے تھے رات کو یہیں سو جاؤ۔ مگر وہ ضد کرنے لگے۔

"چلو ہم لوگ چھوڑ آئیں" شاہد کپڑے بدلنے چلے گئے۔

"کرشن تمہارے پاس تین گاڑیاں تھیں کیا ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"گئیں" انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ جیسے چڑیاں اڑانے جا رہے ہوں۔

"کہاں گئیں؟"

"ایک بیوی نے بیچ لی"

"دوسری؟"

"دوسری قرض خواہ لے گیا"

"اور تیسری؟"

"تیسری وہ لے گئی"

"وہ کون؟"

"وہی؟"

"تمہاری محبوبہ دل نواز؟"

"ہاں۔"

"عجب گھر نیچ ہو۔"

"اس میں کیا شک ہے!"

"مگر وہ تم پر عاشق تھی۔"

"گاڑی پر مجھ سے زیادہ عاشق تھی۔"

جب انہیں پہنچانے گئے تو گھر سے دور سڑک پر ہی موٹر رکوالی۔

"بس یہیں اتار دو۔"

"کیوں؟"

"بس اتار دو، میں چلا جاؤں گا۔ انہوں نے سیما کے گال کو ہاتھ لگایا اور تیز قدم بڑھ گئے۔

میں نے ضد نہیں کی ڈر لگا کہ کہیں دوسری کہنی بھی زخمی نہ ہو جائے۔

ایک دن عجیب علیہ سے چلے آرہے ہیں۔ اندر آئے تو سڑانڈ کا ایک بھبکا بھی ساتھ داخل ہوا۔

"عباس گھر پر نہیں!" معذرت پیش کی۔

"عباس اور مجی کسی فلم کے پریمیر میں گئے ہیں بیٹھو۔"

"شاید کا ایک کرتہ پاجامہ مل جائے گا۔ اور تھوڑا سا پانی!"

"یہ تھوڑے سے پانی کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ کیا آج موری میں پھسل پڑے۔"

میں نے صاف کپڑے گرم پانی اور تولیہ غسلخانہ میں رکھوا دیا۔ نہا کر نکلے تو شاید آگئے۔ اور شغل شروع ہو گیا۔ کرشن نے اس دن کچھ نہیں بتایا۔ ایک دن مہندر ناتھ ملے تو کہنے لگے کرشن اکثر

فٹ پاتھ پر شب گزاری کیا کرتے ہیں۔ کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتے۔ وہاں زمانہ بھر کے قسمت کے ستائے انسانوں میں گھل مل کر ان کا درد اپنے دل میں سمو لیتے ہیں۔ وہاں کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون ہیں کیا کرتے ہیں۔ وہاں سے کھانسی بخار لے کر لوٹتے ہیں اور بیوی سمجھتی ہے وہ کسی محبوبۂ دل نواز کے پہلو میں داد عیش دے رہے ہوں گے۔ حالانکہ ان کی سب سے بڑی محبوبہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ جس کی لگن میں انہیں تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

پھر باون تریپن میں جب ہم لوگ چرچ گیٹ آ گئے تو اس وقت ترقی پسند تحریک بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایک دھارا تھا۔ جو پوری شدت اور جلال سے بہہ رہا تھا۔ بیچ میں چند ناقابلِ عبور چٹانوں کے آجانے سے ٹکڑے ٹکڑے بٹ کر ادھر اُدھر بکھرنے لگا۔ ملنے جلنے کے ذرائع کٹ گئے۔ کبھی یونہی کسی بہانے سے مجروح، سردار جعفری یا عباس کے ہاں مل بیٹھتے اور وقت گلوں شکووں میں کٹ جاتا۔ کوئی ادبی سوال نہ اٹھتا۔ بس شکوہ شکایت پر بات ختم ہو جاتی۔

اڑتالیس انچاس میں جو ادیب اور شاعر جیلوں میں ٹھونسے گئے تھے۔ جب ہی سے تحریک میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ جو اور واضح ہوتی گئیں۔ تحریک نے ہمیں ملایا تھا۔ اور اسی نے بکھیرنا شروع کر دیا۔ ذاتی دوستیوں اور پیار کا رشتہ قائم تھا۔ مگر وہ بھی دن بدن ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بات ختم ہو گئی تھی۔ جو کسی زمانہ میں تھی۔

چھپن میں شاید ایک فلم فلمستان کے لئے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ اس کا اسکرپٹ کرشن لکھ رہے تھے۔ فلم بڑی ڈھیلی چال چل رہی تھی۔ اس زمانے میں کرشن اکثر شاہد کے ساتھ اسٹوڈیو سے آجایا کرتے تھے۔

ایک دن کرشن آئے اور شاہد کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دم بولے۔

"میری کہانی سنو گی؟"

"میں دنگ رہ گئی۔"

کرشن بڑے موڈ میں تھے، پلنگ پر پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اور ایک چھوڑ اپنی چار کہانیاں سنا ڈالیں۔ یہ کہانیاں انہوں نے قلم برداشتہ عجیب موڈ میں لکھی تھیں۔ مجھے ان کے نام بھی یاد نہ رہے۔ اور یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چھپیں۔ یہ علامتی کہانیاں تھیں۔ اس وقت جدید کہانی کا زور نہیں تھا۔ بلکہ میں نے تو علامتی کہانیاں کرشن ہی کی سنی۔ ان میں کرشن کے قلم کی تمام وسعت بھرپور انداز میں جلوہ گر تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایسی کہانیاں پھر نہیں لکھیں۔

ایک دن مہندر ناتھ آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ کرشن در سودا میں نہیں رہتے۔ ان کے ساتھ داور رہتے ہیں۔

"اس چھوٹے سے کمرے میں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں وہ کمرے میں نہیں رہتے کہ ہمیں تکلیف ہوگی۔ زینہ کے پاس تھوڑی جگہ ہے۔ وہیں کھاٹ ڈال لی ہے۔"

"بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"وہ رہتے کہاں ہیں، نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے آکر پڑ جاتے ہیں۔ صبح میں اپنے کام سے نکل جاتا ہوں۔ وہ وہیں کھاٹ پر بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔ شام کو پھر نکل جاتے ہیں۔ انہیں سمندر سے عشق ہے۔ گھنٹوں ریت پر بیٹھے لہریں گنا

کرتے ہیں۔ جی ہی نہیں بھرتا۔"

ایک دن میں اور جمیلہ مجیب کلاب کے بازار میں یوں ہی جھک مار رہے تھے کہ اچانک فٹ پاتھ پر کرشن اور سلمیٰ صدیقی سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ کرشن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جیسے کسی نے انہیں لڈو چراتے پکڑ لیا ہو۔ مگر ہم دونوں سلمیٰ سے گلے ملنے میں مشغول تھے۔ فوراً گڑبڑا کر جمیلہ نے دونوں کو گاڑی میں بٹھا لیا۔ اور کف پریڈ ڈاکٹر حمید کے ہاں لی گئیں، اس سے پہلے کہ کرشن اور سلمیٰ کچھ بولتے انہیں مسٹر اور مسز کرشن چندر کہہ کر ملوا دیا۔ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے۔

کرشن کف پریڈ کی ٹیرس پر کھڑے سامنے پھیلے ہوئے سمندر کی طرف کھوئی کھوئی نظروں سے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔

"چلئے گا نہیں!" سلمیٰ نے چپکے سے پوچھا اور وہ چونک پڑے۔

"چلو ہم تمہیں پہنچا آئیں۔"

"ہم چلے جائیں گے۔" سلمیٰ نے ٹالا۔

"کہاں رہ رہی ہو؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"ہوٹل سی فیس میں۔"

"میرے گھر سے دو قدم پر ہے چلو۔"

ہوٹل کے پچھلے حصے کے سستے کمرے میں پہنچ کر میں نے پوچھا۔

"یہاں کب تک رہو گی؟"

"کیا کریں یہاں مکان ملتا ہی نہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار گئے۔"

"میرے پاس ایک کمرہ ہے۔ جب تک مکان ڈھونڈ میرے ساتھ رہ لو۔"

تھوڑے سے تکلف کے بعد سلمیٰ اور کرشن میرے ہاں آ گئے۔ سارا دن مکان کے چکر میں گھومتے پھر کہیں پیر ٹکانے کا سہارا ہو گیا اور وہ چلے گئے۔ سلمیٰ اپنی نوکری سنبھالنے علی گڑھ چلی گئی۔ کرشن پھر خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارنے لگے۔ شاہد کے فلم کا کام چل رہا تھا۔ اکثر کرشن شام کو ساتھ آ جاتے۔ فلم کا کام کم اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہوا کرتیں۔ آخری ٹرین سے کرشن چلے جاتے۔ کبھی بے خیالی میں آخری ٹرین نکل جاتی۔ تو وہ دیوان پر سو جاتے۔ صبح پہلی ٹرین پکڑ لیتے۔

جملہ پریشانیوں کے باوجود ان کا قلم موتی پرو رہا تھا۔ بڑی شدت سے لکھ رہے تھے۔ جسمانی دکھوں نے ذہن پر اور بھی دھار رکھ دی تھی۔ ان کی تحریروں میں رومانیت کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ طنز بڑی شدت سے ابھر رہا تھا۔

"یہ سلمیٰ اور کرشن کا کیا قصہ ہے؟" ایک دن شاہد نے پوچھا۔

"شادی ہو گئی ہے۔"

"کب ہوئی؟"

"پچھلے نومبر میں جب علی گڑھ اور دہلی گئی تھی۔ میرے اور جمیلہ کے سامنے۔" شاہد مطمئن ہو گئے۔

میں نے سلمیٰ اور کرشن کی آنکھوں میں شادی سے کہیں زیادہ مقدس جذبہ دیکھا تھا۔ زیادہ پائیدار اور پُرخلوص۔ ایک دوسرے کے لئے دوانگی کی حدوں کو چھوتا ہوا عشق۔ شادی صرف مذہب کے ٹھیکیداروں کے دو بولوں کا کام نہیں بلکہ دوستی اور ایک دوسرے میں کچھ پا لینا ہی شادی ہے اس میں دنیاداری کو دخل نہیں ہوتا۔ بغیر کسی ہنگامے کے ایسی شادیاں ہوتی ہیں۔ اور باوجود

مادی مخالفتوں کے ذہنی یکسوئی کا باعث بن جاتی ہیں۔ شاہد کی فلم ختم ہو گئی اور کرشن غائب ہو گئے۔ دشتے جو ترقی پسند تحریک نے جوڑے تھے بکھرتے جا رہے تھے۔ سردار جعفری اور سلطانہ کے علاوہ سب ہی باندرہ اور جوہو کی طرف کھسک گئے تھے۔ کبھی کوئی بہانہ نکال کر اب بھی سب مل بیٹھتے تھے۔ کبھی مجروح کے ہاں شکیلا بانو بھوپالی کا گانا سننے کے بہانے، کبھی واجندر سنگھ بیدی کے یہاں شادی کے سلسلہ میں، کبھی عباس کو ہرک اٹھتی اور ان کے ہاں مجمع ہو جاتا۔ خاص طور پر جب سجاد ظہیر آتے تو سوئی ہوئی حسین یادیں جاگ اٹھتیں۔ ترقی پسندوں کی انجمن میں کچھ جان ڈالی جاتی۔ اور پھر بیتے ہوئے دنوں کی پرچھائیاں ابھر آتیں۔

افرو ایشین کانفرنس کے سلسلہ میں سردار، عباس، ساحر مجروح کے ساتھ دہلی جانا ہوا تو ہمیں نہیں معلوم تھا۔ کہ کہاں ٹھہریں گے۔ اسٹیشن پر سب بانٹ لئے گئے۔ میں کرشن چندر کے حصہ میں آئی۔

"ارے تم یہاں ہو۔ ہم تو تمہیں گم شدہ سمجھ کر رو بیٹھے تھے۔"

"زندگی میں پہلی بار خود کو پایا ہے۔" کرشن نے چپکے سے کہا۔

سلمیٰ بڑے پیار سے ملی۔ میں نے ایک دفعہ اور بھی کرشن کا ایک گھر دیکھا تھا۔ بھوت بنگلہ، دہلی والا گھر نہایت سگھڑاپے سے سجایا ہوا تھا۔ عمدہ فرنیچر، بیش قیمت پردے ڈائننگ روم۔ اور کشادہ بیڈ روم، آنگن میں پھولوں کے پودے اور پام کے گملے، کرشن اس گھر میں کچھ مہمان سے لگ رہے تھے۔

مگر ان کے چہرے پر سکون اور بشاشت تھی۔ کپڑے پھر نہایت صاف ستھرے۔ جیسے میں

نے ان کے جسم پر سن چالیس میں پہلی بار دیکھے تھے۔ ان کے چہرے سے بے سروسامانی کی پرچھائیاں مٹ چکی تھیں۔ آنکھوں میں پُرسکون ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ ہر دم ان کی جذبات سے لبریز آنکھیں سلمیٰ کے اردگرد منڈلایا کرتیں۔ انہوں نے خود کو مکمل طور پر سلمیٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ انہیں جو کھلاتی کھا لیتے۔ سلمیٰ کی چرب زبانی کا اثر ان کی باتوں میں جھلکنے لگا تھا۔

"کیا کہیں سے قارون کا خزانہ مل گیا؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"سلمیٰ جانے وہی سب خرچ اٹھاتی ہے۔"

"سلمیٰ کی جمع پونجی کتنے دن چلے گی؟"

"بس اب ختم ہونے والی ہے!"

"پھر؟"

"پھر سلمیٰ علی گڑھ جا کر نوکری سنبھال لے گی اور ہم وہی اپنے اڈے پر بمبئی۔"

"یہ بھی کوئی زندگی ہوئی؟"

"جو ملے مل جائیں وہی اپنے ہیں۔"

"کل کی فکر؟"

"قطعی نہیں!"

میں نے پہلی بار کرشن کو لکھنؤ کا کڑھا ہوا آستین چنا کرتا دیکھا۔ وہ کوئی چھوٹے موٹے نواب لگ رہے تھے۔

کھانے کی میز پر کوئی دس آدمیوں کا کھانا سجا ہوا تھا۔ کوئی مہمان نہیں آنے والا تھا۔ اور

مجھے برسوں پہلے کا وہ ہوٹل کا کھانا یاد آگیا۔ جو میں نے پہلی بار درسودا کے گھر میں تین بجے کھایا تھا۔

ایک دن کانفرنس ہال سے نکلے تو کرشن جا چکے تھے۔ مجروح نے کہا ہم پہنچا دیں گے۔ مگر ذرا لونگ کی جائے گاڑی میں بھر کے ہم لوگ دہلی کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ جامع مسجد سے نان کباب اور کچھ مٹھائی خریدی سوچا چل کر کرشن چندر کے گھر کھائیں گے۔

مجروح، فردوس، سلطانہ، سردار اور ساحر کے ساتھ رات کے پون بجے کرشن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے!" کرشن سوئی ہوئی آواز میں بولے۔

"تمہاری بیوی!"

کرشن دروازہ کھول چکے تھے ایک دم بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ بند کر دیا۔ ہم قہقہے اڑانے لگے۔ جھینپتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھولا ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سلمیٰ کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کرشن نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا آنچل مٹھی میں دبا لیا۔

ہم ایسا بھونڈا مذاق کرکے پچھتا رہے تھے۔ ایک نام میں کیا جادو تھا کہ دونوں مفلوج ہو گئے۔ جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر ڈالا ہو۔

کرشن نے ہمیشہ دو محبت کرنے والے دلوں کی اپنی تحریر میں ستائش کی۔ ان کی کہانیاں پکار پکار کر انسان کے لئے جینے کا حق مانگتی ہیں۔ انہوں نے پیار بھرے دلوں کا درد اپنی ہستی

میں سمو لیا تھا۔ اور خود چور بنے بیٹھے تھے۔ جیسے انہیں جینے کا حق نہیں دیا تھا۔ وہ کولہو کے بیل تھے۔ ان کی گردن پر جوا رکھا تھا۔ اسے اتار پھینکنے کا حق نہیں تھا۔ مگر کرشن زندگی کے عجیب موڑ پر ایک سرپھری سے دیوانوں جیسا پیار کر بیٹھے تھے۔ جملہ پابندیوں میں زندگی گزارنے کے بعد بھی اس میں جھوٹے بندھن توڑ دینے کی ہمت تھی۔ کرشن کے سوا اسے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ سوائے کرشن کی پکار کے ہر آواز کے لئے اس کے دل و دماغ کے دروازے بند ہو چکے تھے! اس نے اپنے والدین کا والہانہ عشق دیکھا تھا۔ اور زندگی سے ویسا ہی انعام چاہا تھا۔ محبت جو ایک جادو ہے۔ جس کے عدم او رجود پر کسی کا اجارہ نہیں ہو سکتا کوئی راہ فرار نہیں ہوتی — مگر ہاتھ بڑھا کر جام اٹھانے کی ہمت بہت بہت کم ہوتی ہے۔

سلمٰی کا وجود کرشن کو خوب راس آیا۔ ان کی زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ ساحر۔ بیدی اور مجروح کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔ میرا مطلب ہے مالی طور پر، موٹر بھی خرید لی گو زیادہ دن نہیں چلی۔ مگر خرچہ شاہانہ ہی رہا۔ ان کی مقبولیت عوام سے بڑھ کر خواص تک پہنچ گئی۔ وہ جنہوں نے انہیں پڑھا بھی نہیں تھا۔ ان پر بھی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کی مقبولیت کو چار چاند لگ گئے۔ پاکستان میں ان کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی گئی وہاں منٹو کی بے قدری ہوئی ہو لیکن کرشن اردو ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔ روسی اور دوسری زبانوں میں ان کی مقبولیت پھیل گئی۔ پاکستان کے ایک رسالے نے تو باقاعدہ کرشن کے بارے میں رائے عامہ جمع کر کے ایک نمبر مرتب کیا اور ثابت کر دیا کہ کرشن چندر برصغیر کے مقبول ترین اور سب سے بلند مصنف ہیں۔

عموماً ہر طبقہ کے لوگ ان کی عظمت کے قائل تھے۔ مگر ادھر چند سالوں سے کچھ لوگ سوچنے

لگے تھے کہ کرشن چندر عوامی دھارے سے کٹتے جا رہے ہیں۔ کسی میں کھل کر کہنے کی ہمت تو نہ ہوئی لیکن سرگوشیاں ہوئی تھیں کہ کرشن کو اونچے طبقے نے لپک لیا ہے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا لکھ پتیوں اور منسٹروں تک محدود ہو گیا ہے۔ حسب دستور ان کی تحریریں ہتھے پر دھلا نہیں ثابت ہو رہی ہیں۔ کبھی کبھی تو پنجہ چھکڑ پڑ جاتا ہے۔ وہ اب بھی عوامی ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں صداقت کی دھار کند نظر آتی ہے۔ وقت کی پکار ماند پڑتی جا رہی وہ فٹ پاتھ پر فرشتے دیکھنے لگے ہیں۔ ان کا مجبور اور کچلا ہوا ہیرو فلسفی بن کر ذہنی قلابچیں بھرنے لگا ہے۔ وہ سوچنے لگے ہیں کہ غربت اور ناانصافی انسانیت کا خون کرتی بلکہ بلند مرتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔ جہاں وہ ایک عظیم مفکر اور وسیع الدماغ فلسفی بن جاتا ہے۔ گویا یہ سرمایہ داری نظام ایک نعمت ہے وہ جس ٹھاٹھ باٹھ سے خود رہتے ہیں۔ اسی انداز سے رہنے والوں پر جب چوٹیں کرتے ہیں تو کھوکھلے ڈبے جیسی آواز نکلتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب "ان داتا" "مہالکشمی کا پل" اور "کالو بھنگی" جیسی دھار دار حقیقت نہیں جھلکتی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ادیب کے لئے لازمی ہے کہ وہ مفلسی اور قلاشی میں زندگی گزارے تب ہی وہ اعلیٰ درجے کا عوامی ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ اگر اس قول میں ذرہ بھر بھی سچائی ہوتی تو دنیا کے کروڑوں مجبور اور لاچار کرشن چندر بن گئے ہوتے۔

حقیقت یہ تھی کہ جب سے کرشن پر دل کا دورہ پڑا تھا ان کا زندہ رہ جانا ایک معجزہ تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں منع کر دیا تھا کہ بوجھل قسم کی دماغی محنت سے بچیں۔ بھاری بھرکم غم اور یاس سے بھرے موضوع کو شدت وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔

یہ تو لکھنے والے ہی جانتے ہیں کہ لکھتے وقت ادیب کن راہوں سے گزرتا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر کیا بیتی ہے۔ کرشن پر پابندیاں لگ چکی تھیں پھر بھی نہ لکھنا چھوڑ سکے نہ اخباروں اور رسالوں نے انہیں دم لینے دیا۔ وہ بیماری کے بعد بھی لکھتے رہے۔ کرشن کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ لکھنا بند نہیں کر سکتے تھے۔

ایک دفعہ جب وہ بیماری کی حالت میں تھے تب دیکھنے گئی۔ ان پر غنودگی طاری تھی۔ مگر ان کا دایاں ہاتھ متحرک تھا۔ ان جانے میں رواں دواں تھا۔ جیسے خلا میں پرواز کر رہا ہو۔ کچھ سوچ رہا ہو۔

کرشن کہا کرتے تھے "جب میں لکھتا ہوں تو میرا دماغ انگلیوں میں اتر آتا ہے۔ قلم انگلیوں کی گرفت میں آتے ہی میرا دماغ اڑنے لگتا ہے"۔

لیکن سلمیٰ کا بس چلتا تو وہ ان کی سوچ پر تالے ڈال دیتی۔ جس دن سے ان پر دل کا دورہ پڑا سلمیٰ نے انہیں روئی کے گالوں پر پالنا شروع کیا۔ کرشن بچوں کی طرح بدپرہیزیاں کرتے اور سلمیٰ پر کرب طاری ہو جاتا۔

پرستاروں کی دعاؤں۔ دشمن دانوں کی دریا دلی اور سلمیٰ کی جانفشانی اور بھاگ دوڑ نے کرشن کو نئی زندگی بخشی اور وہ پھر سے میدان عمل میں اس شدت سے سرگرم ہو گئے کہ ہر ادبی تحریک ان کے بغیر نامکمل تھی۔

فلموں میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اپنے دو فلم بنا کر وہ اس لائن سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں ان کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا۔ طرز زندگی بدل گیا تھا۔ اس شاہانہ

خرچ کو چلانے کے لئے وہ فلموں کا کام کرتے رہے۔

کرشن سے میری آخری تفصیلی اور بے تکلف ملاقات خود میرے گھر پر ہوئی۔ چند دوستوں کے ساتھ میں نے انہیں کھانے پر بلایا۔ اتفاق سے وہ اس دن ریڈیو کے کام سے بمبئی آرہے تھے۔ وہاں سے وہ کوئی تین بجے میرے گھر پہنچ گئے۔

بہت عرصہ بعد وہ پلنگ پر نہایت بے تکلفی سے لیٹ گئے۔ اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے آرام کرنے کو کہا مگر وہ باتوں کے موڈ میں تھے۔ مختلف موضوعات پر تین چار گھنٹے مسلسل باتیں کرتے رہے۔ منٹو کا ذکر نکل آیا۔ اسے یاد کر کے ہنستے اور آنسو پیتے رہے۔

"کرشن تم کبھی رنڈیوں کے پاس گئے؟"

"نہیں مجھے پیشہ ور عورتوں سے وحشت ہوتی ہے۔ میرے والد جو ڈاکٹر تھے۔ جیل سے وابستہ تھے۔ وہاں پیشہ ور عورتیں گرفتار ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے عبرت ہوتی تھی۔"

"پیشہ ور اور شریف زادی میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو تاج محل ہوٹل اور فٹ پاتھ پر لگے خوانچے میں ہے۔"

"پیٹ تو دونوں جگہ بھر جاتا ہے۔"

"تاج اور شیرٹن کے کھانے سے پیٹ کے ساتھ دماغ بھی آسودہ ہو جاتا ہے۔ اور فٹ پاتھ کے کھانے سے خونی تپیش کے جراثیم سے پالا پڑتا ہے۔"

"شادی بھی تو اکثر پیشہ ہی بن جاتی ہے۔ جو عورت صرف روٹی کی خاطر شادی کرتی ہے۔ اس میں اور ٹکھیائی میں کیا فرق ہے؟"

"صرف نام کا فرق ہے۔"

"کرشن کبھی فٹ پاتھ یاد آتے ہیں؟"

"فٹ پاتھ کیسے بھول سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ فٹ پاتھ پر پایا، سوچنا، سمجھنا سیکھا، لکھنا تو بعد کی بات ہے۔ اصل چیز تو سوجھ بوجھ ہے۔ بیماری نے مجھے زندگی کے دھارے سے کاٹ دیا ہے۔ اب تو ادھار کے لمحوں پر جی رہا ہوں۔"

"کبھی موت کا خیال آتا ہے تو؟"

"موت بھی ایک دلچسپ تجربہ ہوتی ہوگی؟"

"زندگی سے زیادہ دلچسپ؟"

"زندگی بہت پیاری شے ہے۔ مگر جب زندگی ملی تو بیماری لگ گئی۔"

"کبھی خودکشی کا خیال آیا؟"

"اکثر مگر زندگی نے بڑھ کر پیر تھام لئے بارہا میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر سوچا کرتا تھا۔ اس کی تہہ میں کتنا سکون ہوگا؟"

"کیا ایک عورت سمندر کی تہہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ہاں اور بھنائی ہوئی موجوں کا تھپیڑا بھی۔ وہ قادر مطلق ہے۔ جلاتی بھی ہے اور مارتی بھی ہے۔ کرشن فسانہ نگاری پر اتر آئے۔"

"کفر نہ بکو دوزخ میں جاؤ گے۔"

پھر کچھ پیسوں کا ذکر نکل آیا۔

ہر مہینے چادر سے پیر نکل جاتے ہیں۔ مکان کا کرایہ، ٹیلی فون کا بل، ٹیکسیوں کا خرچہ، دعوتیں، شراب! ارے ہاں شراب منگاؤ۔"

"شراب کا جھول ہے۔"

"ارے بابا میری دعا ہے۔"

"اچھا بھئی رو مت نہیں، اللہ کچھ انتظام کردے گا۔ کیا یہ سب جھنجھٹ زندگی کیلئے ضروری ہیں؟"

"قطعی! میں جی بھر کے جینا چاہتا ہوں۔ موت میرے دروازے پر دستک دے چکی ہے۔ کسی وقت بھی اچانک پکار سکتی ہے۔ میں اُسے سب دینا چاہتا ہوں۔ جو وہ تج کر میرے ساتھ آئی ہے۔" ہم نے "اُسے" کی تشریح نہیں کی۔

"میں خود کو ایک مہمان سمجھ کر خاطر کرتا ہوں۔"

"چھوڑو ان باتوں کو ابھی بہت جینا ہے۔ بوڑھے کھوسٹ ہو جانا ہے۔ اور تب بھی یونہی ایک دوسرے سے اُلجھنا ہے، روٹھنا اور منانا ہے، پھر سب مل کر ایک دفعہ پاکستان جائیں گے، جوشؔ، فیضؔ، قاسمیؔ، ہاجرہ، خدیجہ سب سٹر گئے ہوں گے۔ وہاں ایک لمبے چوڑے میدان میں گلے ملیں گے۔"

پچھلے سال جولائی میں ان پر شدید حملہ ہوا۔ کئی منٹ کے لئے دل کی دھڑکن بند ہوگئی۔ بمبئی کے بڑے بڑے اسپیشلسٹ جٹ گئے۔ انہیں پھر موت کے منہ سے نکال لیا گیا۔ پیس میکر لگا دیا گیا۔ اور وہ پھر جی اُٹھے۔

پاکستان میں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جو عقیدت کرشن چندر سے ہے۔ اس کی مثال دنیا

میں کم ملے گی۔ جو ملتا تھا ان کے بارے میں سوال کی بھرمار کر دیتا تھا۔

عید کا دن تھا ایک لڑکا بوکھلا ہوا آیا۔

"چودہ میل سے سائیکل پر آرہا ہوں۔ چودہ گھنٹے گھر ڈھونڈنے میں بیت گئے۔ بس یہ پوچھنا تھا کرشن جی کیسے ہیں؟"

"بالکل اچھے ہیں۔"

"اس نے شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گیا۔

پاکستان سے واپس آکر میں اور بہن جمیلہ کرشن کو دیکھنے گئے۔ پلنگ پر لیٹے سیب کاٹ کر سب کو بانٹ رہے تھے۔ بہت دبلے پتلے ہو گئے تھے۔ مگر چل پھر رہے تھے۔ بات بات پر ہنس رہے تھے۔ پیس میکر دکھایا۔ ایک ڈبیہ سی جلد کے نیچے بند تھی۔ اس کے ہل جلتے پر دل دھڑک رہا تھا۔

آٹھ مارچ ۷۷ء دہلی میں نورالحسن صاحب کی بیٹی کی شادی تھی۔ مراثنیں سہاگ گا رہی تھیں۔ دولہا کی بہنیں آنچل ڈالے اسے مسند پر بیٹھی ہوئی دلہن کی طرف لا رہی تھیں۔ پنڈال برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بچے گلکاریاں مار رہے تھے۔ کسی کی ٹھوکر لگی اور سوئچ نکل گیا۔ شامیانے میں اندھیرا ہو گیا۔

کرشن چندر! کسی نے تاریکی میں ہولے سے کہا۔

"کیا ہوا کرشن کو؟" اندھیرے سے پوچھا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ صبح!"

مگر دوسرے لمحے پلگ واپس لگ گیا۔ روشنیاں پھر جگمگا اٹھیں۔ شہنائی پھر بج اٹھی۔ کرشن کے سینے میں پیس میکر لگا ہوا ہے۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بے تار برقی ان کے دل سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کا دل ان الفاظ میں دھڑک رہا ہے۔ جو کاغذ کے صفحوں پر آویزاں ہیں۔ ان کا دل کیسے چپ ہو سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ بولتا رہے گا۔ موت کی انجانی ٹھوکر سے پلگ نکل جاتا ہے۔ دم بھر کو لگتا ہے سب چراغ بجھ گئے اب کبھی نہ جاگیں گے۔

مگر سلسلہ پھر جڑ جاتا ہے۔

آنے والی نسلوں کے لئے جلائے ہوئے چراغوں میں فنکار کے دل کی دھڑکن مقید ہے۔

اور چراغ روشن ہیں۔

سارٹیفکیٹ

عابدہ بی ہولائی ہوئی داخل ہوئیں۔

برقعہ اُتار کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں نے انہیں جی بھر کر رونے دیا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا وہ ایسی بے بسی سے کیوں رو رہی ہیں۔ انہوں نے مصیبتوں کے پہاڑ ہنس کر نہیں جھیلے مگر روئی پیٹیں بھی نہیں۔ کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے تو غصہ میں بھنّا کر چوکھی صلواتیں سنانے لگتی ہیں۔ نہ خاندان سے شکوہ نہ زمانے سے شکایت بس بہت ہوا تو جو سامنے آیا مار بیٹھیں گی۔ بچے خوب جانتے ہیں وہ ان سے غصہ نہیں حالات پر طیش آ رہا ہے۔

پانی پی کر منہ پر چھپکے مارے برقعے کے گھیر سے منہ پونچھا۔

"خیریت تو ہے عابدہ بی؟" میں نے انہیں ذرا ٹھنڈا ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"خیریت ہوتی تو کیا میری مت ماری گئی تھی جو رات کے گیارہ بجے آپ کے گھر یوں دوڑی آتی۔ اللہ، مجھے موت بھی نہیں آتی۔"

وہ اور بے حال ہو گئیں۔ بگڑ کر بولیں "ایسی بھی میری مت نہیں ماری گئی ہے کہ بے وقت

آپ کو پریشان ۔۔۔؟"

"میری پریشانی کو ڈالو چولہے میں اپنی کہو، کیا شمو کے دولہا پر پھر بھوت سوار ہوا ؟"

"نہیں بی، اللہ کے فضل سے جب سے نوکری مستقل ہوئی ہے سب ٹھیک ٹھاک ہے"

"تو پھر ؟" شادی مرد سے نہیں اس کی نوکری سے ہوئی ہے بے زر عشق ٹیں ٹیں !

"کلو ہے رفیق نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا"

"کوئی نیا گل کھلایا ؟" رفیق ان کا پہلوٹھی کا پوت پلکا پورا بے نتھا بیل، چھ فٹا پٹھان، لڑکیاں نگوڑے پر مکھیوں کی طرح بھنکتی تھیں۔ اکنومکس میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو کر جوتیاں چٹخا رہا تھا۔

"کیا بتاؤں کلو ہے نے اب کے تو بس حد کر دی۔ وہ موئی رینو"

"اچھا تو رینو اب تک چل رہی ہے۔ رفیق میاں تو موسم کے ساتھ محبوبہ بدلتے ہیں پھر کلموہے کی ۔ ؟"

"موئی کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ تیسرا مہینہ لگا ہے"

"نوبت یہاں تک تو کبھی نہیں پہنچی تھی۔ ٹھیک ہے، کمبختوں کا چٹ پٹ نکاح پڑھا دو"

"لڑکی ہندو ہے"

"تو مسلمان ہوتے کتنی دیر لگتی ہے ؟"

"بڑے خاندان کی ہے۔ با اثر لوگ ہیں۔ کہتی ہے پتہ چلا تو اندھیر مچ جائے گا۔ جب سے سنا ہے میرے تو ہاتھ پاؤں کا دم نکل گیا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں بادا جان مل میں اسسٹنٹ تھے۔ تھرا جان کو لگ گیا۔ مہینوں سے کھاٹ پکڑلی تھی۔ ان کے بعد سے میں نے پانچوں کو سکول کی نوکری اور ٹیوشن کر کے پڑھایا زیور کا تار تار پہلے ہی ٹھکانے لگ چکا تھا۔ بس اب

تو جی چاہتا ہے کہ سمندر میں چھلانگ لگا دوں پاپ کٹے"

"وہ کیسے ڈوبیں گی باواجان نے مارے لاڈ کے تیرنا بھی سکھا دیا تھا۔ اور پھر زندہ نکل پڑیں تو پولیس بڑی کھینچل کرے گی"

صابرہ بی بڑے اونچی ناک والے خاندان سے تھیں۔ زیادہ پڑھنے پڑھانے کا چلن نہیں تھا پھر بھی قرآن اور اردو کے سہارے میونسپل سکول میں نوکری مل گئی تھی۔ بیس بائیس سال کی بات ہے جب تک ولایت امریکہ اور عرب ملکوں کے اتنے چوپٹ دروازے نہیں کھلے تھے بٹوارے کے بعد ہجرت کرنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ پاکستان کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ خاندان کے بیشتر لوگ تو کھسک لئے منور خاں بمبئی تک آ کر اٹک گئے مل میں نوکری مل گئی تو بیوی کی گھنٹی گلے میں باندھ دی گئی۔

"اچھا تو آریا سماج طریقہ سے شادی کرا دو کمبختوں کی"

"ہے ہے لال باغ میں بس پوری بلڈنگ میں ہمارا ہی ایک مسلمان گھر ہے۔ پرانی عمارت ہے ورنہ کبھی کے مار کے بھگا دیئے گئے ہوتے ادھر محمد علی روڈ بائیکلہ وغیرہ میں تو فٹ بھر جگہ بھی نہیں ملتی بڑا نازک محلہ ہے لال باغ بٹوارے کے وقت کیا خون خرابہ ہوا تھا۔ بات باہر نکل گئی تو اندھیرا ہو جائے گا۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ رینو کے ماں باپ تو مختلف مندروں کی یاترا پر گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں بس بڑی بہن جو دوھوا ہیں رہ گئی ہیں۔ بڑی کڑوی ہیں۔ رینو تک سے چھوت چھات کرتی ہیں۔ گیان دھیان میں لگی رہتی ہیں۔ رینو کا ان ہی سے دم نکلتا ہے انہوں نے اسے پال پوس کر ہی رنڈاپا بتایا ہے۔ رفیق کے بارے میں ان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں۔

میں نے سینما کے ٹکٹ منگوا رکھے تھے اس لئے انہیں اس وقت بغیر سوچے سمجھے ٹال دیا کہہ دیا۔

"کل صبح دونوں کو میرے پاس بھیج دو۔" دوسرے دن دونوں ہونق چہرے لئے آن ٹپکے سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔ بڑے بڑے روشن خیال لیڈر لمبے چوڑے بھاشن دیتے ہیں، سب بھائی بھائی ہیں۔ سب ہندوستانی ایک سمان ہیں۔ مگر بے چاروں کو یہ تھوڑی معلوم تھا کہ ایکتا کا پرچار یہ رنگ بھی دکھا سکتا ہے۔ بزرگوں کی روشن خیالی کبھی نوجوانوں کی زندگی میں تاریکی بھی بن جاتی ہے۔ ملنے جلنے اور ایک دوسرے کے تیج تہوار میں شرکت کرنے سے دوریاں مٹ جاتی ہیں لیکن کبھی کبھی خطرناک قسم کی نزدیکیاں بھی ٹوٹ پڑتی ہیں۔

دونوں صبح مجرمانہ صورتیں لیے آن پہنچے۔ رفیق تو ایک ڈھیٹ بھر مرد ذات دانت نکوسے جا رہا تھا۔ رینو کی صورت پر بارہ بج رہے تھے۔ دونوں نے خودکشی کے بھی زاپٹے کھینچے مگر بزدلی آڑے آ گئی۔

میں نے بغیر سوچے سمجھے دونوں کو سول میرج کے دفتر میں لے جا کر عرضی دلوا دی معلوم ہوا کہ پندرہ دن بعد جا کر شادی کر سکتے ہیں۔

"تم دونوں پندرہ دن تک ایک دوسرے سے نہیں ملو گے۔" میں نے اپنی کارگزاری کی فیس کے طور پر حکم لگایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رینو منہ بسور رہی تھی۔

"یہ تو نہیں ہو سکے گا۔" رفیق نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ رینو رونے لگی۔ کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں کھاسی ہوئی۔ نہایت دانش مندی سے فیصلہ کیا گیا۔

"ایک ہی راستہ ہے کہ ہم خودکشی کر لیں۔" دونوں فلمی ڈائیلاگ بولنے لگے۔

"گدھے پن کی بات نہ کرو۔ تین جانوں کا سوال ہے کیمنو۔" مجھے غصہ آ گیا۔

"ملنے سے کیا فرق پڑے گا؟ یہ بدھو بڑی ڈرپوک ہے۔ سمجھتی ہے میں فلمی ولن کی طرح اسے دھوکہ دے جاؤں گا۔"

غصہ آرہا تھا، میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ واقعی ملنے سے اب کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ دس بارہ ہندو مسلمان عیسائی لنگے ہوٹل میں غل مچاتے رہے ایک دم رینو رونے لگی۔ معلوم ہوا "دیدی یاد آرہی ہے"۔

دیدی جس نے ننھی سی بہن کو پال کر ماں کی بیماری ہی نہیں سنبھالی تھی اپنے جوان رنڈاپے کو بھی بہلایا تھا۔

"ایک بار دیدی کے پیر چھو کر شما مانگ لوں"۔ رینو پھوٹ پڑی۔ سب پر گمبیرتا چھا گئی۔ گلے بھر آئے آنسو چھلک پڑے۔

نئی پود کا طور طریقہ ولائتی ہو گیا ہے۔ ولائتی سکول کالجوں میں ولائتی سبق پڑھتے ہیں۔ قصے کہانیاں پڑھتے ہیں۔ جنسی آزادی کا سبق لیتے ہیں۔ اور ہندوستانی جکڑ بندیوں پر بھی عمل کرتے ہیں۔ حرام حلال کا چکر بھی چلتا ہے۔ آزادی کے لیے جان پر کھیلنے کو بھی تیار دلوں میں گناہوں کے چور بھی پالتے ہیں۔ جو موقع بے موقع اودھم مچاتے ہیں۔

ملے ہوا دیدی سے آشیر واد اوش ہی لی جائے گی۔ اور پوری پلٹن ہم رکاب منزل بیابانی کی صورت میں دیدی کے حضور میں پہنچی۔

دیدی چوکا بچھا کر نکل رہی تھیں۔ پنڑہ داہ کی بات سن کر پل بھر کے لئے سناٹے میں رہ گئیں۔ پھر زخمی شیرنی کی طرح جھپٹ کر انہوں نے رینو کی کلائی پکڑ لی۔

"بھاگ جاؤ بدمعاشو۔ رینو نابالغ ہے، اس کا بیاہ بنا گارجین کی مرضی کے نہیں ہو سکتا"۔

"مگر رینو نے تو اٹھارہ سال آٹھ ماہ عمر لکھوائی ہے"۔ رفیق نے سمجھانا چاہا۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔ سکول سرٹیفکیٹ میں سترہ سال آٹھ مہینے لکھی ہے"۔ دیدی رینو کو گھسیٹ کر کمرے میں بند کرنے لگیں۔ براتی بھونچکے، دولہا میاں کی مٹی گم۔ سوائے اس کے

اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ رینو کا ہاتھ چھڑا کر براتی مع دولہا میاں کے بھاگ پڑیں۔

رات گئے تک اودھم مچانے کا پروگرام خاک میں مل گیا۔ دولہا دلہن اپنے گھر پہنچے تو دروازے پر پولیس موجود تھی۔ دونوں کو تھانے لے گئی۔

تب صابرہ بی بوکھلائی ہوئی نازل ہوئیں میری جان پر فون کے ذریعہ میں نے انہیں جان بوجھ کر پھنسایا تھا۔ سول میرج کروائی تھی۔ ایک نابالغ ہندو لڑکی کو اغوا کرنے میں مدد دی تھی۔ اگر میں نے فوراً پہنچ کر معاملہ کو سلجھانے کا ٹھیکہ نہ لیا تو وہ میرا نام پولیس کو دیدیں گی۔ کیونکہ میں نے ہی ورغلا کر ارتکاب جرم میں مدد کی تھی۔ میرے دستخط بطور گواہ دفتر میں محفوظ ہیں اور میں قطعی پھنس جاؤں گی۔ پھر وہ ٹیرس پر سے مع بچوں کے سیمنٹ کی سڑک پر چھلانگ لگا دیں گی۔

گھر میں اس وقت نلش چل رہا تھا۔ میرے پاس دو لال بیگیں براج رہی تھیں۔ اور ٹیبل پر ٹوٹ پھوٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میں نے میز پر پتے پھینکے اور نوٹ بٹورہ میں ٹھونس کر صابرہ بی سے التجا کی کہ میرے پہنچنے سے پہلے چھلانگ ہرگز نہ لگائیں کہ میں نے اتنا حسین نظارہ اپنی آنکھوں سے آج تک نہیں دیکھا ہے۔

میں صابرہ بی کو لے کر پولیس سٹیشن پہنچی۔ دیدی روئی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگیں۔

"اغوا کا کیس درج ہوا ہے۔ لڑکی کی بڑی بہن اور گارجین کی طرف سے سکول سرٹیفکیٹ میں عمر ۱۸ سال سے کم ہے۔ لڑکی نابالغ ہے" کسی پولیس والے نے بتایا۔

"کہاں ہے سرٹیفکیٹ؟ میں نے پوچھا۔"

"خاندانی سیف میں چابی والدین کے پاس ہے۔ گارجین نے تار دیا ہے، کل دوپہر تک وہ دونوں واپس پہنچ رہے ہیں۔ فون پر بات ہو جائے گی۔ کال بک کی گئی ہے۔ دہلی کے لئے۔ والدین دہلی میں ہیں۔"

"رینو پولیس کی حراست میں رہے گی۔؟"

"نہیں بہن اس کی گارجین ہیں، ان کے سپرد کر دی جائے گی۔"

"دیدی جھوٹ بول رہی ہیں۔ سیف میں کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ کبھی لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی" رینو نے سرگوشی میں بتایا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی اجازت لے لی تھی۔

"تمہارا کس سکول میں داخلہ ہوا تھا بمبئی میں؟"

"ماؤنٹ میری کانونیٹ باندرہ میں مگر وہاں میری عمر غلط لکھی ہوئی ہے۔"

"تم پیدا کہاں ہوئی تھیں۔؟"

"دہلی میں۔"

"وہاں چنگی کے دفتر سے مل جائے گا سرٹیفکیٹ۔ مگر بڑی دیر لگے گی۔"

"جب تک تم حراست میں کیسے رہو گی۔ دیدی ضمانت پر چھڑا سکتی ہیں۔"

"نہیں، میں دیدی کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔"

"رفیق کو حراست میں رہنا پڑے گا۔"

میرا سر گھومنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مگر نہ جانے کیسے میں نے کہہ دیا۔

"میں سرٹیفکیٹ کانونیٹ سے لا سکتی ہوں۔ ایک گھنٹہ کی مہلت چاہیئے۔"

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ کانونیٹ کے چرچ میں روشنی جگمگا رہی تھی پھاٹک پر پہرہ ہوتا ہے۔ مگر احاطے میں داخل ہونے پر پابندی نہیں۔

ضعیف مدر پیریر کو جگانے پر کسی نے احتجاج نہیں کیا ایک کمسن راہبہ جو ابھی نن کے عہدے پر فائز نہیں ہوئی تھی۔ میری درخواست پر اندر گئی۔ مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے اندر طلب کر لیا گیا۔ معصوم ضعیفہ کی آنکھوں میں تھکان اونگھ رہی تھی۔ جھریوں دار پُر نور چہرے پر

تقدس کی شمعیں روشن تھیں۔ مہربان آنکھوں میں بے وقت جگائے جانے پر ناگواری کے بجائے شکرگزاری تھی، کہ کسی کی حاجت روائی کسی وقت بھی کارِ ثواب ہے۔ سائل کے لئے کبھی دروازے بند نہیں۔

میں نے بڑی تفصیل سے پوری داستان سنادی۔ کوئی سوال نہ اٹھا۔ اتنی رات گئے پیدائش کی تصدیق کے سرٹیفکیٹ کی مانگ پر کوئی اعتراض نہیں۔ رجسٹر منگوایا گیا۔

"مقدس ماں، یہ عمر کا اندراج غلط ہے۔ رینو کی عمر اٹھارہ سال آٹھ ماہ ہے۔"

"رجسٹر میں ایک سال کم درج ہے۔"

"سول میرج کے لئے اٹھارہ سال کی قید ہے۔"

"تین ماہ بعد ہوگی شادی۔"

"شادی تو ہوگئی۔" میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تفصیل بتائی۔ تو مدر سپیریر کا جھریوں دار چہرہ غصہ سے لرزنے لگا۔ مقدس روشنی ماند پڑ گئی۔

"زانی کی سزا سنگساری ہے۔"

"مگر اس عروس البلاد بمبئی میں پہلا پتھر کون مارے گا۔ مقدس ماں؟"

"جھوٹا سرٹیفکیٹ مانگنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"سچا سرٹیفکیٹ چاہیئے مدر۔ یہ جھوٹا ہے۔ عام طور پر لڑکیوں کی عمر چھپائی جاتی ہے۔ کم ظاہر کی جاتی ہے کہ لڑکی کی جوانی والدین کے لئے کوڑھ کی طرح گھناؤنی ہے۔ مرد کمسن لڑکی چاہتا ہے۔ اس لئے والدین لڑکی کی عمر چھپاتے ہیں۔"

"دونوں سزاوار ہیں۔ گناہ کی بخشش صرف خدا کی مرضی پر ہے۔ اور مذہب خدا کے احکامات کے احترام کا محافظ ہے۔"

"پردہ داری گناہ کی ترغیب کا پیش خیمہ ہے۔" مادر محترم نے فیصلہ کن انداز میں رجسٹر بند کردیا۔

"مگر سوچئے تو دو گناہ گار انسان بھیانک تباہ کاری کا باعث بن سکتے ہیں۔ فرقہ دارانہ فساد کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ لال باغ ایریا میں خون خرابہ عام ہے۔ اس کی روک تھام ہر مذہب کا اولیں فرض ہے۔"

"جھوٹ اور دھوکہ دہی کسی مذہب میں جائز نہیں۔"

"وہ جھوٹ جو انسانوں کی پھوٹ اور خون خرابہ کو روکے سب سے بڑا سچ ہے۔ ہر مذہب انسان کی بہتری کے لئے اتارا گیا ہے۔ وہ خون جو یسوع مسیح نے انسانی حقوق کی رکھوالی کی خاطر بہایا آج بھی تازہ اور گرم ہے۔"

"مگر جھوٹا سرٹیفکیٹ . . . ."

"جھوٹا نہیں رینو کی عمر کا سچ، جو مصلحت پسندی کی بنا پر آج جھوٹ بنا ہوا ہے۔ میں عیسیٰ مسیح کے مقدس خون کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں کہ جلد سے جلد دہلی کی میونسپلٹی سے سچا سرٹیفکیٹ پیش کردیا جائے گا۔ ورنہ دو انسانوں کی زندگی تو چند روز بعد بھی تباہ کی جا سکتی ہے۔ اگر دہلی سے آنے والا سرٹیفکیٹ اسے بالغ ثابت نہیں کر سکا تو۔" سسٹر پیپر یہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر اٹھیں اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی مقدس ماں اور مصلوب بیٹے کے مجسمہ کے سامنے دو زانو ہو کر اپنے جڑے ہوئے ہاتھوں پر پیشانی جھکا دی۔ رات بڑی اندھیاری تھی ذہنی تھکان سے عاجز آکر میرا سر بھی جڑے ہوئے ہاتھوں پر جھک گیا۔ انگلیوں کے دس پورے جب آپس میں رگڑ کھاتے ہیں تو عجیب مقناطیسی طاقت ظہور میں آتی ہے۔ مجسم وجود ایک نکتہ میں سمٹ آتا ہے۔ موت اور زندگی کے راز سربستہ کھلنے لگتے ہیں۔ لمحے جیسے کہ ان گنت ایک جیٹ کی رفتار سے بیت رہے تھے۔ ایسے وقت کی ناپ تول صرف اس ذرہ عظیم کے وجود میں ہے جو

قضا اور قدر کا مالک ہے۔ وقت سوئی کی نوک پر ٹھہرا کانپ رہا تھا۔

کنواری ماں اپنے مصلوب لختِ جگر کا ٹوٹا ہوا جسم اپنے ناتواں ہاتھوں میں سنبھالے صبر اور سکون کا بے مثال معیار قائم کر رہی تھی۔ شرم اور ندامت کی ایک جھپکی بھی نہیں کہ سنگ مرمر کی آنکھیں آنسو نہیں بہا سکتیں۔ مجھے اس وقت ساری دنیا کے خداؤں کی اشد ضرورت تھی، وہ کسی فرقہ یا قوم کے ہوں کوئی بھی ہوں کتنے بھی ہوں۔ آئیں اور چمتکار دکھائیں، چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں، سدرشن چکر کہاں رکھ بھولے کرشن کنہیا برنگ بش کی سب چنگاریاں کہاں جا سوئی ہیں۔ لائے سنجیونی بوٹی ہنومان جی، اگر رینو کو گھبراہٹ میں کچھ ہو گیا تو میں کسی کو معاف نہ کر پاؤں گی۔ سب پر سے ایمان اٹھ جائے گا۔

رینو سخت بینچ پر پڑی لرز رہی ہو گی۔ رفیق جیل میں سڑ جائے گا۔ صابرہ بی مع صاحبزادیوں کے ٹیرس سے چھلانگ لگا دیں گی۔ اور دنیا بھر کے کھنڈیرے سر پر ڈھے پڑیں گے۔ یگ بیت رہے ہیں۔ بارہ کی چوٹ فضا میں گونج رہی ہے۔ بوڑھی راہبہ نے سر اٹھایا۔ کنواری ماں جیسے مسکرا پڑی۔ مصلوب مسیح کے زخمی پیر کو بوسہ دیا اور اگر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سے سبز نیلی اور کاسنی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

کمسن راہبہ جو ابھی نوسکھ تھی نن نہیں بنی تھی یسوع مسیح کے حرم میں داخلہ نہیں پایا تھا۔ دق کی مریضہ سکون سے موت مرنے کا نوینٹ میں آ گئی تھی۔ رجسٹر کھولے آگے بڑھی۔

پیاری لاڈلی مدر پیریر نے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیئے۔ جس میں رینو کی سچی عمر درج تھی۔

میں نے سرٹیفکیٹ بٹوے میں رکھا اور فلش میں جلتی ہوئی دو بیگموں کی بخشش گلک میں ڈال دی۔ مدر پیریر نے رجسٹر کھولا۔ ہولے سے مدر میری کی اور دیکھا اور آنکھ مار دی۔ منھ پھاڑ کر اٹھیں اور متقدس "ماں اور بیٹے" کے قدموں پر روشن شمع کی لو کو سونپ دیا۔ شعلہ بھڑکا سان

کا چہرہ آسمانی نور سے جگمگا اٹھا۔ جیسے سوئی ہوئی منہ بند کلی نسیم سحری کے نرم جھونکے کے لمس سے یکایک مسکرا پڑی۔

رینو کی عمر کا جھوٹا گواہ، رجسٹر کا پرانا صفحہ خاکستر ہو چکا تھا جلے ہوئے کاغذ کے ٹوٹے ٹوٹے قتلے مرمریں فرش پر دوڑتے بھاگتے سمندر کی گنگناتی لہروں کی طرف لڑھک رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر سونے والوں کے میلے کچیلے ڈھیر میں کوئی بچہ کلکاریاں مار کر ہنس رہا تھا۔ پتہ نہیں جنم سرٹیفکیٹ اس کے پاس تھا کہ نہیں!

✣

کارساز

دوپہر تندور کی طرح تپ رہی تھی۔ پرندے گھونسلے نہ جانے کس غار میں دبکی بیٹھی تھی۔ ننگے پیڑ سوکھے ہاتھ پھیلائے بھک منگوں کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ ایک سوکھا مرا کتا دیوار کے سائے میں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔

"قیامت کے دن سورج سوا نیزے پہ اتر آئے گا۔ اور زمین سینہ پھاڑ کر پگھلتی ہوئی آگ اگلنے لگے گی۔ تب گنہگار موہنہ کے بل گر پڑیں گے۔"

مگر مولوی رفاقت علی کیوں مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اوندھے منہ گر پڑے؟ وہ تو بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ انہیں تو کبھی کوئی گناہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ چاہے جون مینہ برستا ہو کہ آندھی اپنا تیہا دکھا رہی ہو۔ ان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔

دم بھر میں لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح بلوں میں سے نکل کر جمع ہو گئے ــ مولوی صاحب

ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ پسینہ پرنالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔ لوگ نئی نئی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا دردِ قولنج ہے۔ کسی کی رائے تھی کہ دل کا دورہ پڑا ہے یا شاید یوں ہی پھسل گئے۔ دھان پان سے تو تھے بے چارے۔

اور اُسی وقت فرشتہ رحمت کی طرح بچن بابو آ گئے۔ فوراً موٹر روکی اور ہٹو ہٹو کہتے اترے بچن بابو میونسپلٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ محلے محلے خاک چھانتے پھرتے تھے۔ مولوی صاحب کے محلے میں تو لوگ انہیں دیکھتے ہی نہایت ضروری کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ دکانوں میں تالے پڑ جاتے اور مسجد میں جماؤ ہونے لگتے۔ بمیٹ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ جتنی جتنی ملک میں روشن خیالی بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ شدت سے فرقہ پرست ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں کو نمٹانے میں بڑے بل بیل لگانے پڑتے ہیں۔

بچن بابو نے فوراً موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو اٹھا کر گھر پہنچایا۔ پوسٹ آفس سے فون کر کے ڈاکٹر کو بلوایا۔ بیگم آڑ میں کھڑی میلے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بچے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ مولوی رفاقت بڑے سرنجاں مرنج انسان تھے۔ لالہ جی کی ٹال پر بادن روپے مہینے پر حساب کتاب لکھ دیتے تھے۔ بچوں کو قرآن پڑھا دیتے تھے۔ چھ بچوں اور بیوی سے لدی پھندی گاڑی نہ جانے کن طلسمی گھوڑوں کے بل پر گھسیٹ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے آکر اس امر کی تصدیق کر دی کہ مولوی صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ حالت نازک ہے۔ ہلانے جلانے سے دم توڑ دیں گے۔ بچن بابو نے لگامیں سنبھال لیں اور فوراً ایک ہسپتال کا ایک بیڈ منگوایا۔ ہینڈل چلانے سے اوپر نیچے اٹھتا تھا۔ ایک آکسیجن سلنڈر بھی اضافی منگوا لیا۔

جسے دیکھ کر بیگم حواس باختہ ہو گئیں۔ بولیں "ہے ہے یہ موا بم کاہے کو آیا ہے؟"

سارا محلہ ٹوٹ پڑا، جیسے کوئی سرکس کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ نیلی کنی کی سفید ساڑی پہنے نرس نے آکر تو ٹھاٹ جما دیئے نہ جانے کہاں سے ایک فوٹو گرافر ٹپک پڑا اور کھٹا کھٹ تصویریں اتارنے لگا۔ دوسرے دن اخباروں میں تصویریں نکل گئیں جن میں بچن بابو ہیرو کا رول ادا کر رہے تھے ضرورت تو نہیں تھی۔ لیکن ایک ایسی بھی تصویر لے لی گئی جس میں ڈاکٹر مولوی صاحب کو آکسیجن دے رہے تھے۔ اور بچن بابو نلکی سنبھالے ہوئے تھے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بچن بابو زبردست اکثریت سے چناؤ جیت گئے۔ محلے کا ایک ووٹ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا۔

مولوی صاحب اچھے ہو گئے مگر بچن بابو کی مہربانیوں میں فرق نہ پڑا۔ اخباروں میں مولوی صاحب پر مضمون نکلنے لگے۔ ان کے انٹرویو چھپے۔ "عربی اور فارسی کا عالم فاقوں مر رہا ہے، کیسی ناقدری ہے!" ویسے مولوی صاحب میٹرک فیل بھی تھے۔ بچن بابو نے ان کی بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فنڈ کھول دیا۔ اپنی جیب سے پانچ ہزار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو فنڈ سے دس ہزار کا عطیہ بھی ملا اور ان کے سیکرٹری کا خط بھی آیا ہے۔ بڑے بڑے دھن والوں نے دل کھول دیا۔ چالیس ہزار کا پرس گورنر صاحب کے ہاتھوں مولوی رفاقت کو ایک شاندار جلسے میں پیش کیا گیا۔

بچن بابو نے فنڈ جمع کرنے کے لئے بڑے جوش و خروش سے جلسے کئے۔ دلیپ کمار کو صدارت کرنے کے لئے آمادہ کر لیا اور شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی کرائی۔ ہر جلسہ بہت کامیاب رہا۔ بچن بابو کا ایک فلیٹ خالی پڑا تھا اس میں انہوں نے یوں ہی آفس بنا رکھا تھا۔ مولوی صاحب اس میں

اٹھ آئے۔ چند برس میں ان کی کایا پلٹ ہو گئی۔ انگریزی اسکول میں داخل ہو گئے۔ بیگم نے تنگ پاجامہ چھوڑ کر ساڑی پہننا شروع کر دی اور انہیں پردہ بھی چھوڑنا پڑا کیوں کہ اب چھوٹے موٹے جلسے ان کی صدارت میں ہونے لگے تھے اور انہیں سوشل ورک وغیرہ کے سلسلے میں بہت گھومنا پڑتا تھا۔

مولوی صاحب کی تقریریں بڑی پابندی سے چھپتیں اور ریڈیو سے نشر کی جاتیں۔ جن کا لب لباب یہ ہوتا کہ ہم ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔ کوئی اونچ نیچ کا سوال نہیں۔ سب کی برابر کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ اقلیتوں کے نمائندے بھی آواز رکھتے ہیں۔

بچن بابو نے باقاعدہ "رفاقت فنڈ" کا دفتر کھول رکھا تھا۔ ایک رسالہ بھی مولوی صاحب کی سرپرستی میں نکلنے لگا تھا جس کا واحد ایک مقصد "اردو بچاؤ" تھا۔ یہ رسالہ اردو کی بقا کے لئے بڑے زور شور کی جدوجہد کر رہا تھا۔ بچن بابو "اردو بچاؤ سوسائٹی" کے روح رواں تھے۔ "رفاقت فنڈ" سے اردو ادیبوں کو انعامات دیئے جاتے تھے۔ لوگ تو الزام تراشی میں مزہ لیتے ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ سارے انعامات بچن بابو کے چمچوں کو ہی عطا کئے جاتے ہیں۔ ان جلسوں میں بڑے بڑے فلمی ستارے موجود ہوتے تھے۔ فلمی پریاں بروشر بیچتی تھیں اور جھولی پھیلا کر چندے جمع کرتی تھیں۔

مولوی رفاقت کی صحت بن گئی تھی جسم بھاری ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی توند بھی نکل آئی تھی۔ جو ان کی پوزیشن پر بہت جچتی تھی۔ ہاں بیگم کچھ زیادہ ہی بھر گئی تھیں۔ ورزش کے لئے انہیں کلینک جانا پڑتا تھا۔

مسجد جانا تو بیماری کی وجہ سے چھوٹ ہی گیا تھا مگر کبھی کبھی جمعہ کی نماز پڑھنے اور عید الفطر عید بقر پر پابندی سے مولوی صاحب حضور تشریف لے جاتے تھے کبھی اپنے محلے میں چلے جاتے

تھے۔ تو باقاعدہ جلوس نکل جاتا۔ وہاں کے رہنے والے فخر کرتے تھے کہ مولوی صاحب کبھی ان کے محلے میں رہا کرتے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ اتنا مرتبہ پاکر بھی غریبوں سے اتنے خلوص سے ملتے تھے۔

اس عرصہ میں مسز اندرا گاندھی تخت پر بیٹھ چکی تھی اور وہ [illegible] سالہ بڑھتی جلد ہی تھی۔ مولوی صاحب ان سے کئی بار اقلیتوں کے نمائندے کی حیثیت سے اور "اردو بچاؤ" کے سلسلے میں بڑی امید افزا ملاقاتیں کر چکے تھے۔ ان کے ساتھ کھنچوائی ہوئی تصویریں بڑے نمایاں ڈھنگ سے ان کے فلیٹ کے کمرے کونے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے اخبار میں میڈم کی سیاسی بصیرت و دانائیاں، ان کی موروثی ذہانت اور دور اندیشی پر مسلسل تبصرے چھپتے رہتے تھے۔ بھارت کا کلیان کرنے کے لئے قدرت نے ایک ناری کے روپ میں درگا کو بھیجا۔ انہوں نے ایک طویل نظم ان کی کارگزاریوں پر لکھی تھی۔ جو کئی زبانوں میں ترجمہ کر کے دیس کے کونے کونے تک پہنچائی گئی۔ جب وہ نظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے دہلی گئے تو ٹیلی ویژن اور آکاش وانی نے بڑی خوبصورتی سے اس تاریخی واقعہ کو عوام کے مفاد کے لئے پیش کیا۔ بیگم بھی اس مقدس موقع پر موجود تھیں اور پورے وقت کیمرے کے لینس کو گھورتی رہیں۔

بیگم پر تو اس ملاقات کا نشہ سا چڑھ گیا ان کے ساتھ کھنچی ہوئی پردھان منتری کی تصویر سنہری فریم میں جڑوا کر ڈرائنگ روم میں ایسی جگہ ٹانک دی کہ ہر آنے جانے والے کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔ پھر وہ بڑی تفصیل سے ہر مہمان کو اس سہانی ملاقات کا ذکر سناتیں۔ ایسا شاندار نقشہ کھینچتیں کہ سننے والا بھونچکا رہ جاتا۔ کچھ بدمزاج لوگ اس عظیم واقعہ کی روداد سن سن کر بور

ہو چکے تھے۔ اور بیگم کے پاس جاتے ہوئے کانپتے تھے مگر جب وہ اپنی نیم باز آنکھوں میں تقدس بھر کر کہتیں "ہماری وزیر اعظم ایک عورت نہیں ایک معجزہ ہیں" تو سب جھوم اٹھتے۔ مولوی صاحب کی تو بات ہی اور تھی، خود بیگم کی اتنی دور دور پہنچ ہو گئی تھی کہ سفارش مانگنے والوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ سنا تھا وہ بڑے بڑے ایوارڈ اور پدم شری وغیرہ تک دلوانے لگی تھیں۔

اسی وقت مولوی رفاقت صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔

کچھ کوڑ مغز لوگوں کا خیال تھا کہ دل کا دورہ مولوی رفاقت صاحب پر بچن بابو نے مصلحتاً پڑوایا تھا۔ چندہ جمع کرنے کے نئے مواقع پیدا کرنے کے لئے ایک عدد دورے کی اشد ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ کیسے کم ذوق ہوتے ہیں لوگ۔ کسی کی بہتری دیکھ کر جل مونڈا ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی سرمایہ دار کا کاروبار ترقی کرتا ہے۔ تو کیا یہ ملک کی ترقی نہیں ہوئی؟ بمبئی میں جو فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئی ان سے بمبئی کی شان بڑھی کہ نہیں؟ ان میں ان عمارتوں کا کیا قصور لاکھوں انسان فٹ پاتھ پر یا جھوپڑے ہی میں رہتے ہیں اور بمبئی یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ ملک کا زیادہ تر منافع چند مٹھیوں تک رہ جاتا ہے خدا جسے چاہے دولت دے جسے چاہے عزت دے، ایک چنا ہوا طبقہ اللہ کو پیارا ہے تو اس میں جل مرنے کی کون سی بات ہے؟

بچن بابو نے مولوی رفاقت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کیا یہ مسلم طبقہ کی خوش حالی کا ثبوت نہیں؟ اگر اسی طرح لوگ ہر بچنوں اور آدی باسیوں کی دیکھ ریکھ کریں تو ملک کا سب سے بڑا سوال چٹکی بجانے میں حل ہو سکتا ہے۔ مگر بچن بابو جیسے دیش سیوک ہوں تب نا۔ آج مولوی صاحب کے دن پھرے۔ کل پورے طبقے کے دلدر دور ہو جائیں گے۔

اس دورے میں مولوی صاحب شہر کے بہترین نرسنگ ہوم میں رہے۔ اخباروں میں ان کی بیماری کی خبر پڑھ کر لوگ ٹوٹ پڑے بڑے بڑے عہدہ دار اور منسٹر تک عیادت کے لئے آئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا کہ گورنر صاحب بھی لیڈی گورنر کے ہمراہ تشریف لائے۔ جلنے والوں نے کہا صرف گورنر صاحب ہی تشریف لائے۔ لیڈی صاحبہ نہ آسکیں۔ کچھ سرپھروں نے کہا نہ گورنر تشریف لائے نہ لیڈی گورنر۔ سب پروپیگنڈہ ہے۔ بے پر کی اڑائی گئی ہے۔

بڑے زور شور سے چندہ جمع ہوا جلسے ہوئے، فلمی شو ہوئے۔ دو دو سو کے ٹکٹ بکے۔ سوونیر میں اشتہار الگ جمع ہوئے فلمی ستاروں نے خوب ہلا گلا کیا۔ پتہ چلا اس سودے میں ٹوٹا رہا، کیوں کہ بڑے ستارے حسب عادت غوطہ دے گئے۔ اور چھوٹے فن کاروں پر پبلک نے چپلیں برسائیں۔ ایک گمنام سی فلمی پری نے ایسا طوفانی رقص پیش کیا کہ مولوی صاحب اگر اپنے پرانے محلے میں ہوتے تو ضرور کہتے: لاحول ولا قوۃ! مگر انہوں نے آنسو بھری آواز میں سب کا شکریہ ادا کیا۔ پبلک کے غل غپاڑے میں کوئی نہ سن سکا۔ وزیر اعظم نے اپنے فنڈ سے بیس ہزار دیئے اور عیادت نامہ بھی ارسال کیا جسے بیگم رفاقت ہر آنے جانے والے کو کسی بہانے دکھا دیتیں۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ فرقہ پرستی ہمارے خون میں رچ بس چکی ہے۔ لوگوں کو بچن بابو اور مولوی رفاقت کا بھائی چارہ پھوٹی آنکھ نہ بھایا۔ انہوں نے ان کے کان بھرنا شروع کئے۔ سب سے زیادہ انہوں نے بیگم کو بھڑکایا۔ وہ غریب فوراً بھڑک گئیں۔ عورت ذات کانوں کی کچی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ "رفاقت فنڈ" میں گول مال ہو رہا ہے۔ بچن بابو مختلف ناموں کے کاروبار چلا رہے تھے۔ چھوٹی موٹی فیکٹریاں کھول رہے ہیں۔ فلیٹ خرید رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے نام پر لوٹ مچا رکھی ہے۔ کئی

سینما ہال خریدے ہیں جن میں مولوی صاحب کا کہیں ذکر نہیں۔ وہ تو نرے اُلو ہیں، جنہیں کچھ خبر نہیں۔ مولوی صاحب نے بیگم کے تقاضوں سے تنگ آکر بچن بابو سے حساب پوچھ لیا۔ کچھ دن تک تو وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹالتے رہے، پھر ایک دم ٹرا مان گئے بڑی تُو تُو میں میں ہوئی، بچن بابو بُری طرح روٹھ گئے۔ مولوی صاحب کے چھکے چھوٹ گئے ''رفاقت فنڈ'' گھاٹے میں جانے لگا۔ سارا غصّہ بیگم پر اُترا۔

''اری نیک بخت، خواہ مخواہ اسپن ڈلوادی'' انہوں نے بیگم کی ٹانگ لی بچن بابو خفا ہو گیا۔ اب کیا ہوگا؟''

''ہو جانے دو خفا۔ کیا مُرغ نہ ہوگا تو صبح نہ ہوگی۔'' وہ بولیں ''افتخار بھائی کہتے ہیں۔ گاڑی چل نکلی ہے اب روکے نہ رُکے گی۔ جیسے اللہ نے ہمارے دن پھیرے ویسے سب کے پھیرے اور پھر افتخار بھائی اپنے ہیں۔''

''ارے چل موئے! کون سا فراڈ؟ آیا بڑا فراڈ کا بچہ!'' بیگم بولیں۔ مگر مولوی صاحب نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ اگر گندگی اچھلنے لگی تو بیڑا ابھر جائے گا۔ بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا ٹھیک نہیں۔''

بڑی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ بیگم کے دل میں ہول اُٹھ رہے تھے۔ دولہا کو ستر ہزار گھوڑے جوڑے کے دینا طے پایا تھا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ بس بچی کی شادی پر انہوں نے جا کر بچن بابو کے پاؤں پکڑ لئے۔ جو ناچاقی اِدھر اُدھر کے لوگوں نے کرا دی تھی وہ خلیج بنتی جا رہی تھی۔ بیگم نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر بچن بھیا شادی میں نہیں بیٹھے تو بات اٹھوا دیں گے۔ اور بچی کو زہر دے دیں گی۔ آخر نور جہاں ان کی منہ بولی بیٹی تھی۔ بچن بابو رو پڑے۔

ایسا جی کھول کر انتظام کیا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ کیا ہنگامہ رہا۔ ہفتہ بھر چار دن تک بدیسی شراب پانی طرح لنڈھائی گئی۔ باوجود اس قحط ماری کے سیکڑوں آدمی صبح شام تر مال اڑاتے رہے۔ مین شادی کے دن کو معاملہ بالکل شہنشاہی رہا۔ اپنی پوزیشن کا کچھ تو فائدہ یار دوستوں کو بھی ملنا چاہیئے۔ دیارام جی جنرل ٹیکس کے افسر تھے، انہوں نے کیٹرنگ کا انتظام اپنے ذمے میں لے لیا۔ شہر کے چند بڑے بڑے ہوٹلوں سے دنیا بھر کی نعمتیں حاضر ہو گئیں۔ اتنا لذیذ اور بافراط کھانا تو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی شاید ہی کسی ایک دسترخوان پر نظر آیا ہو سارا گھر بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

چند فسادیوں نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ شادی میں قانوناً مقرر کی ہوئی تعداد سے دس گنا مہمان تھے۔ بدتمیزوں نے موٹریں گن ڈالیں، مہمان گن ڈالے، اور پولیس تک پہنچ گئے بڑی بے عزتی ہو گی۔ مولوی صاحب نے قسمیں کھا کھا کر اخباروں میں تردید کی مگر کافی ہلڑ مچا۔ پھر جیسے سارے ہنگامے اٹھتے ہیں اور خود بخود بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہنگامہ بھی بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ اگر اس وقت مولوی صاحب کے ساتھ بچن بابو اور ان کے بار سوخ دوست نہ ہوتے تو غریب الٹے ٹنگ جاتے۔ اللہ رحیم و کریم ہے وہ سب کے عیب ڈھکتا ہے۔ اخبار تھوڑے دن چیخ چلا کر دم توڑ گئے۔ ورنہ سنا تھا وزیراعظم ننگی تلوار ہیں کسی کو نہیں بخشتیں۔ لیکن بچن بابو نے بڑے بڑے زہریلے ناگ کھلائے تھے۔ اور یار لوگوں کو بھی صاف بچا لاتے تھے۔ دراصل ان ہی دنوں ایمرجنسی لگی تھی۔ اخباروں کے گلے گھٹ رہے تھے۔ صرف وہ اخبار زندہ رہ سکے جو ایمرجنسی کے گن گانے کو تیار تھے۔ نہ جانے کیسے بچن بابو نے مولوی صاحب پر کئے جانے والے

اعتراضات کو اقلیت کے خلاف پروپیگنڈے کا روپ دے کر ساری مخالفتیں دبا دیں۔

اسی رات مولوی صاحب نے ایمرجنسی پر ایک شاندار نظم لکھی۔ جس میں انہوں نے اس نئے قانون کو ملک کی قسمت کی روشن ترین کھڑکی سے تعبیر دی جس کے ذریعے آسیبی لعنتیں دور ہوتیں اور جتنی نعمتیں اندر آتیں ملک کے دشمن اور انسانوں کا خون چوسنے والے اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کو کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا۔ اور بچھڑے ہوئے طبقے کے نمائندوں اور اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ انصاف ہوا۔ ان کے حق ان کو مل رہے ہیں۔ غریبی تیزی سے غائب ہو رہی ہے اور عام انسان خوب پھل پھول رہا ہے۔

اسی شام انہوں نے اپنے نوکر چھوٹو کو چھری سے اتنا مارا کہ وہ آدھ مرا ہو گیا۔ اس نے بیگم کے کانوں کی بالیاں چرائی تھیں۔ چھوٹو کو پولیس لے گئی اور مال اگلوانے لگی۔

رات کو جب ان کی بیٹی صغریٰ اپنی سہیلی کی پارٹی سے لوٹی تو اس کے کان میں اپنی بالیاں جگمگاتی دیکھ کر پسینہ آگیا۔

مگر اب کیا ہو سکتا ہے، بیگم! کیس پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ بڑی بدنامی ہو گی۔

مولوی صاحب نے سمجھایا۔

بیٹی کی شادی تو دھوم دھام سے ہو گئی۔ مگر بیگم کچھ اکھڑ گئیں۔ ان پر خدا جانے کیوں ایک دم جہالت کا بھوت سوار ہو گیا۔ شادی میں بڑے ہی پھوہڑپن اور کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا۔ اول تو باہر ہی نہ نکلیں، ہوسٹس کی غیر موجودگی میں ظاہر ہے۔ محفل سونی اور بے رنگ رہی۔ بچی بابو کی گرل فرینڈ نرملا کھنہ نے اگر مورچہ نہ سنبھال لیا ہوتا تو بھد اڑ جاتی۔ مسز بجن موہنہ تھوتھائے مسز رفاقت کی پارٹی

میں شامل رہیں۔ نرملا کمنہ نے ہر کمی کو پورا کر دیا۔

شادی کے بعد اور ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ مگر مولوی صاحب بچن بابو کی بات کے قائل ہو گئے کہ بغیر ایک حسین اور جوان ہوسٹس کے ان کی پرسنیلٹی نہیں چمک سکتی۔ یہ بیگم کے بس کا روگ نہیں۔ کافی بیٹ بیک کا اندیشہ ہے۔ بیگم کا سلیقہ گھر کے دائرے تک محدود رہا ہے۔ ہائی سوسائٹی میں وہ اکھڑ جاتی ہیں اور مولوی صاحب پر شبہ کرنے لگتی ہے۔ کہیں نہ کہیں ایسا جھول ڈال دیتی ہیں کہ ہائی کلاس کے لوگ کھٹک جاتے ہیں۔ ملگجا تیلی کوٹ کا پرانا پاجامہ پہنے بادلوں کی طرح دوڑتی پھریں۔ اگر نرملا کی طرح کاسنی شرارے والا جوڑا پہن لیتیں تو خاصی جم جاتیں۔

کتنی تعلیم یافتہ اور حسین لڑکیاں شادی کے مارکیٹ میں طاق پر رکھی سڑ جاتی ہیں۔ کوئی نوکری کے بھاری بھر کم دولہا کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ اسکولوں اور دفتروں کی نوکریاں بور کر دیتی ہیں۔ لیکن پرائیویٹ سیکرٹری ٹائپ کی نوکریاں کافی دل چسپ اور باعزت سمجھی جاتی ہیں۔ بہت سے سمجھدار لوگ ایک آدھ فلیٹ گھر کے علاوہ بیوی سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ جہاں یار دوستوں کی خاطر وغیرہ میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ اس فلیٹ کو جو اکثر خالی پڑا رہتا ہے کسی جاذب نظر ہوسٹس کے وجود سے سنوار دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ بزنس کی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو گھر میں نہیں کی جاتیں۔ پینے پلانے کی دعوتوں میں جب کچھ یار دوست ترنگ میں آ جاتے ہیں تو بیوی بچوں کی موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں رہتا۔

بچن بابو کی رائے سے مولوی صاحب نے ایک فلیٹ نرملا کی جگری دوست سروج بھاٹیہ کے نام سے لیا اور فرنشنگ بھی سروج کے ذوق کے مطابق کرا دیا۔ بیگم عموماً پینے پلانے کی محفلوں میں

بادھا ڈال دیتی تھیں۔ "کیوں جی، یہ مرا اور کتنی پڑھائے گا۔ مرکھنے ہاتھی کی طرح جھوم رہا ہے۔" وہ کہتیں اور مولوی صاحب بڑی مشکل سے انہیں ٹال دیتے۔" ارے بھئی کاغذ کا کوٹا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تم سمجھتی تو ہو نہیں۔ اور بیگم سمجھ جاتیں کاغذ کا جو کوٹا ملتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ بلیک میں بیچ دیا جاتا تھا۔ اسی سے تو اخبار کا خرچہ نکلتا تھا جو زیادہ تر مفت کو بانٹا جاتا تھا۔

سروج بھاٹیہ کمال کی ہوسٹس ثابت ہوئیں۔ مولوی صاحب کے دوست احباب کا دائرہ کافی وسیع تھا سروج جس اسکول میں پہلے کام کرتی تھیں وہ ایک تو پارٹ ٹائم جاب تھا اور گھر سے بہت دور پڑتا تھا۔

پھیل چکا تھا۔ بڑی بڑی کمیٹیوں پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی گرل فرینڈ برابر کی حق دار مان لی گئیں۔ بیگم کو لوگ بھول بیٹھے۔ مس سروج بھاٹیہ بالکل منسٹروں کی بیگموں کی طرح صدارت کرنے لگی۔ اسکول کالجوں میں انعامات بانٹنے اور لیکچر دینے لگی۔

بیگم بہت بدکیں۔ مگر مولوی صاحب نے سختی سے سمجھایا کہ سروج بھاٹیہ کا وجود ان کی پوزیشن قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بے چاری بیگم دو پیٹ کر بیٹھ رہیں۔ بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔ لڑکے ممالک ولایت کے پگوڑوں پر رہتے۔ ڈھنڈھار فلیٹ میں پڑی مکھیاں مارا کرتی تھیں۔ ساری ہو حق سروج بھاٹیہ کے فلیٹ میں ہوتی۔ خود ان کی بیٹیاں ان سے کترانے لگیں۔ وہ جب بھی میکے آتیں بیگم مس سروج کا دکھڑا رونے لگتیں۔ جبکہ دوسرے فلیٹ میں رنگارنگ کے ہنگامے رہتے تھے۔ بڑے بڑے آدمی جمع ہوتے تھے۔ وہاں بیٹیوں کو اپنے شوہروں کا مستقبل سنوارنے کی امیدیں تھیں۔ اس لئے وہ پاپا کی گرل فرینڈ کے ارد گرد منڈلایا کرتیں۔

مولوی صاحب کا ایک پاؤں دہلی میں رہتا تھا۔ بیس نکاتی پروگرام کامیاب بنانے میں وہ سر پیر سے جٹے ہوئے تھے یوتھ کانگریس کے بڑے زبردست حمائتیوں میں گنے جاتے تھے۔ وہی یوتھ کانگریس جو مستقبل کی تقدیر سنوارے دے رہی تھی۔ جو دیش کی کایا پلٹ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی وہی سنجے گاندھی جنہیں ورثے میں قوم کی خدمت کا جذبہ ملا تھا۔ مولوی صاحب سے سنجے جی بڑے بے تکلف تھے۔ جب ملتے پیٹھ پر دھپ مار کر نہائت پیار سے کہتے "ہیلو ایڈیٹ کیا حال چال ہے مولوی!"

"آپ کی دعا ہے" مولوی صاحب گھگھیاتے۔

نس بندی پسان کی نظمیں باقاعدگی سے چھپا کرتی تھیں۔ ان میں سے یوتھ کانگریس کی کارگزاریوں کا نمایاں طور پر ذکر ہوتا، جن کے ناخدا سنجے گاندھی تھے جو دیکھتے دیکھتے دیس پر خدا کی رحمت بن کر طاری ہو گئے تھے۔ سروج بھاٹیہ نے رخسانہ سلطانہ سے بہنا پا جوڑ لیا تھا۔ دونوں مل کر دیس سُدھار کے پروگرام بنایا کرتیں۔

بڑے زور شور کی محفل جمی تھی مس سروج بھاٹیہ کا جنم دن تھا۔ کاگ پر کاگ اُڑ رہے تھے۔ دور چل رہے تھے۔ جب سے ڈاکٹروں نے رائے دی تھی۔ مولوی صاحب موہنہ جھٹالنے لگے تھے، اور دو چار پیگ لے لیا کرتے تھے۔

"کیا رائے ہے؟" بچن بابو نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"یہ جو مارچ میں الیکشن ہو رہے ہیں"

"میڈم اپنی کامیابی کے پورے یقین کے بغیر قدم نہیں اُٹھاتیں۔"

"مگر الیکشن کی اس وقت کیا ضرورت ہے؟"

"اس الیکشن سے وہ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ان کی پوزیشن کتنی محفوظ ہے۔"

"اور جو کانگریس ہار گئی تو؟"

"کل آپ کہیں گے سورج مغرب میں نکل آیا تو؟"

"مگر دشمنوں کو آزاد کر دیا ہے یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟"

"ارے، ان دشمنوں میں دم نہیں کاٹھ کے اُلو ہیں۔ پہلے بھی ساتھ مل کر ہار چکے ہیں۔"

سب نے مس سروج سے گانا سنانے کی فرمائش شروع کر دی اور بات ٹل گئی۔

مولوی صاحب بیٹھے اگلے شمارے کا ایڈیٹوریل لکھ رہے تھے قرآن اور حدیث کے حوالوں سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اسلام نس بندی کا حامی ہے۔ بڑے مزے کا مضمون بندھ رہا تھا کہ بچن بابو بوکھلائے ہوئے آئے۔ بال بکھرے ہوئے۔ کپڑے گرد آلود، حواس گم۔

"کچھ موسم کی بھی خبر ہے؟"

"کیا ہوا؟"

"وہ جس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ رائے بریلی سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔"

"اچھا؟"

"میاں جی، کانگریس کا تختہ لوٹ گیا۔"

"اماں گھاس کھا گئے ہو؟ بریلی تو میڈم کا گڑھ ہے۔"

"ارے بھائی، لوگ تو دیوی جی کا نام سننے کو بھی تیار نہیں۔ دیکھئے نا میری کیا مٹی پلید کی ہے۔ موٹر کے شیشے توڑ ڈالے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔"

"تو تم خواہ مخواہ حواس باختہ ہوئے جا رہے ہو۔" ارے دو چار غنڈے اودھم مچا رہے ہوں گے۔ "سارا ملک غنڈہ گردی پر تلا ہوا ہے خاک ڈالئے اس ایڈیٹوریل پر۔ یہ اب نہیں چلے گا۔"

"مگر پہلی قسط تو پریس میں گئی، اور چھپ بھی گئی۔ تم تو خواہ مخواہ ذرا سی بات پر ہول کھانے لگتے ہو۔"

"دیکھئے مولوی صاحب، میں ذمے دار نہیں ہوں۔" بچن بابو ایک دم اُٹھ کر چل دیئے۔

اور ایوننگ نیوز میں آگیا کہ بچن بابو نے جنتا پارٹی جوائن کر لی۔ مولوی صاحب کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لشتم پشتم بچن بابو کے ہاں دوڑے گئے۔

"آپ کا کیا ہے، مولوی صاحب" وہ بولے "آپ اقلیت کے نمائندے ہیں۔ آپ کی تو ہر حکومت میں پکسٹ ہو جائے گی ذرا سے اُلٹ پھیر سے کام بن جائے گا۔ مصیبت تو میری ہے جی کہ میں تو دیوی جی کی ناک کا بال تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یوں میری ساری دوڑ بھاگ خاک میں مل جائے گی۔"

اور مولوی صاحب نے بڑی تیزی سے اُلٹ پھیر شروع کر دی۔ ایڈیٹوریل پھاڑ دیا گیا۔ مشین پر چڑھا ہوا شمارہ راتوں رات جلا دیا گیا۔ ساری نقصان دہ تصویریں گھر کے کونے کونے سے اُتاری گئیں۔ اُن کی گھر میں موجودگی بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔ بیگم نے سنہرے فریم میں جڑی میڈم کی اور اپنی تصویر کمسوٹ کر مدینہ شریف کا رنگین فوٹو لگا دیا۔

دوسرے دن ایک بہت بڑے جلسے میں مولوی صاحب نے ایمرجنسی کی زندگی پر مدلل

تقریر کی اور جنتا پارٹی کو ڈیموکریسی کا محافظ، عوام کا ہمدرد اور انسانیت کا علم بردار ثابت کر دیا۔
اور جنتا پارٹی نے انہیں لپک کر فوراً گلے سے لگا لیا۔
اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔
وہ سب کی ناؤ پار لگا دیتا ہے۔

پینی

اُس نے باری باری دونوں پیر زمین پر پٹخے ہاتھ اور گہرے جیبوں میں ٹھونس لیے۔ جیسے جیبوں کی تہہ میں سنٹرل ہیٹنگ کا کوئی معجزہ چھپا ہو۔ اونی دستانوں کے باوجود برف کی سلاخوں جیسی انگلیاں کچھ ستا لیں۔

غصہ میں اس نے صبور کی وہ ٹوپی بھی پینی کے کھینچ ماری تھی جو اس نے پچھلے ہفتہ بطور تحفہ دی تھی۔ کس قدر احمقانہ حرکت تھی۔ مگر اُسے کیا پتہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس کے پیروں پلٹ کر رونے کی بجائے حیرت زدہ منہ پھاڑے بیٹھی رہ جائے گی۔ دروازے سے نکلتے وقت اُس نے پینی کی گھٹی ہوئی چیخ سُنی تھی یا شاید اس کے کان بج رہے تھے۔ کیونکہ جب جھگڑے کے بعد وہ کبھی نہ پلٹنے والے ڈرامائی انداز میں دروازہ دھڑاکے کے ساتھ بند کر کے ٹیوب اسٹیشن کی طرف لپکا تھا تو اسے پینی کی سسکیوں اور کٹ کٹ بولتے جوتوں کی آواز نہیں سنائی دی۔ ظلم روڈ پر مڑتے وقت وہ ایک لمحہ کے لئے سگریٹ سلگانے کو رکا۔ اُس کے پیچھے سڑک سنسان پڑی تھی۔ صرف پارک کی ہوئی گاڑیوں کی لال روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ سب سے کم قیمت

سکّے کے نام والی پینی اُسے بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔

"چہرے کی مرمت کر رہی ہوگی" اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ پینی بیت الخلاء جاتے وقت بھی بے اختیاری طور پر ناک پر پاؤڈر کا پچارا ضرور پھیر لیا کرتی تھی۔ عمارت کچھ زیادہ ہی تیزی سے ڈھے رہی تھی۔ وہ کینگٹن کی طرف چل پڑا۔ نہایت تیز قدم کہ اگر پینی بھاگتی ہوئی لرزاں خیزاں آئے تو اُسے رپٹانے کے لئے کافی لمبی سڑک ملے۔

آج اس نے پینی کو بہت رُلایا تھا۔

"یا تو اس گھر میں نی نی رہے گی یا میں!" اُس نے دبنگ آواز میں اعلان کر دیا تھا۔ مگر پینی اُن دونوں کے بغیر جی نہیں سکتی۔ نی نی اُس کی جان تھی تو عرفان اس کا جگر۔ اتنی اہم اشیاء کے بغیر کوئی کیسے جی سکتا ہے۔ پینی کے آنسو ہر دم تکے کھڑے رہتے تھے۔ نی نی دم بھر کو نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو جائے تو فوراً لڑکھڑا کر بہنے لگتے۔ سمجھاتے سمجھاتے بے چارے کا حلق خشک ہو جاتا۔ مگر جب تک نی نی واپس نہ آ جاتی پینی زندگی اجیرن کر دیتی۔

اُس نے بہت سمجھایا، نی نی سیانی ہو گئی ہے اُسے عاشقوں کی چاہ وارفتہ کیے ہوئے ہے اور یہ سردی کا موسم تو اور بھی جی کو آگ لگاتا ہے۔ مگر پینی بھڑک اٹھتی، یہ سراسر بہتان ہے ایک کمسن نادان ایرانی نژاد پر۔ نی نی نہایت میٹھی اور رسیلی سہی ہر ایسے غیرے کو منہ نہیں لگاتی۔ سخت نمک چڑھی ہے۔ جب ہی تو اس کی نسل خراب نہیں ہوئی۔ اُسے نی نی کی نازک مزاجی پر بڑا فخر تھا۔ بالکل رائل فیملی والا حساب کتاب تھا۔ قیمتی روپیہ سڑک پر چکر کاٹتے نہیں ملتے۔ بڑا خرچہ آتا ہے ان کے ملن پر۔ مگر خود پینی نہایت غیر شاہانہ مزاج کی تھی۔ اس کا باپ جنک کلرک تھا۔ اس کی دو بڑی جنہیں کینیڈا اور آسٹریلیا میں بڑی کامیاب شادیاں رچا کر عیش کر رہی تھیں۔ اس کا ایک بھائی مڈل ایسٹ میں انجینئر تھا۔ دو مرا ہوا بار تھا۔۔

سب سے چھوٹی تھی اور انگریزی زبان بڑا مضبوط زینہ ہے ایک دفعہ اچھی طرح پکڑ میں آجائے، صورت شکل کام چلاؤ بھی ہو تو ادھر یورپ ملکوں میں فٹافٹ ترقی کی بلندیوں کو چھوا جا سکتا ہے شروع میں اس کے باپ نے روپے بھیجے اور ماں بھی ہر سال ایسٹر کرسمس پر کچھ نہ کچھ بھیجتی رہی پھر والدین کی طلاق ہو گئی اور دونوں نے الگ الگ شادیاں کرلیں تو امداد بند ہو گئی۔ اُسے انگریزی کام چلاؤ نہ آ سکی۔ اوپیر گرل یعنی دو چار گھروں میں اُوپر کے کام کو نمٹا لینے سے اچھی خاصی گذر ہو جاتی ہے۔ کہ کسی کے ساتھ کمرہ شیئر کرنے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ مگر وہ انگریزی سیکھنے کی خواہش مند کا ساتھ بے کار ثابت ہوتا ہے۔ رہا بوائے فرینڈ کا سہارا تو انگریز منہ میں گھنگھنیاں ڈالے رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے انگریزی سیکھ گئی تو لونڈیا بھاگ جائے گی۔ اس لئے زیادہ وقت بوس و کنار میں صرف کرتا ہے۔ نیگرو کی انگریزی سے اللہ بچائے اور پھر رہ گئے ایشیائی نوجوان۔ پاکستانی ہندوستانی شکل صورت کے بھی ٹھیک انگریزی اوّل نمبر کی بولتے ہیں مگر بڑے ہی نیروماٹنڈیڈ چھوٹتے ہی شادی پر مُصر۔ کم بخت جتنا نادار ہو گا اتنا ہی شادی کا انتہائی شوقین۔ یار دوست وقت بے وقت نازکی اور نہایت روشن خیالی پر مُصر!

روٹی کپڑے کے سہارے کی متلاشی ہوتی تو اپنے دیس میں بھی دولہاؤں کی کمی نہ تھی۔ مگر سیلانی طبیعت کی ہر لڑکی پہلے دنیا دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ حمل ضائع کرا لینے کے بعد اب خاصی تجربہ کار ہو گئی تھی۔ روزی کمانا کیا مشکل ہے۔ ولایت میں کم بخت ایک نہ ایک دن تو انگریزی آ ہی جائے گی۔ پھر وہ پہلے تو امریکہ جائے گی۔ وہاں کروڑپتی سڑکوں پر رکتے ہیں۔ انگریز جاگیردار اطالین شہزادے فرانسیسی ہوٹلوں کے مالک اب صرف باربرا کارٹلینڈ کی ناولوں ہی میں ملتے ہیں ورنہ زیادہ تر یہ آنہ پیر گرلز بڑے چکروں سے گزرتی ہیں۔ انگریز بہت جلد اکتا کر نئے جوڑے میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ بچہ ٹھکانے لگانے میں کامیابی نہ ہو تو جھیل جاتی ہیں۔ بہت مانگ ہے گود لینے والوں میں اچھے

دام ملتے ہیں۔ بچے کو بعض فیملی خود پالنے لگتی ہیں یا والدین کو بخش دیتی ہیں۔ پنشن کے بعد والدین جی بہلانے کے لئے کتے بلیاں اور بچے بھی پال لیتے ہیں۔ گورنمنٹ سے بھی کچھ مدد ملتی ہے۔

پینی کم عقل دماغ نہیں بس ذرا بھولی سی ہے۔ ہر جاندار چیز پر ماستا بکھیرنے لگتی ہے۔

پہلے میں سمجھتی تھی آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ انگلینڈ کا ایک حصہ ہیں سب انگریز ہی ہوئے مگر بعض لوگ بہت برا مانتے ہیں اگر گھپلا کردو۔ بالکل آزادی کے بعد اپنے دیس کے صوبوں کی طرح وہاں بھی یہی نیشن ہے۔ گجراتی۔ مراٹھی، سندھی، پنجابی پھر جنوب میں مدراسی، بنگلوری کیرالائٹس اور نہ جانے کتنے۔ جیسے انگلستان میں سب انگریز نہیں یہاں بھی سب ہندوستانی نہیں۔

انگلینڈ میں بھی اوپر گرز مجھے تو کوئی انگریز نہیں ملی۔ ہم تو سب ہی چٹی چمڑی والوں کو انگریز سمجھتے ہیں۔ جھاڑو دینے والی میم کو میں نے انگریز کہہ دیا تو وہ بہت خفا ہوئی کہ وہ آئرش ہے۔

پینی کا پہلا عاشق بھی انگریز تھا تھوڑا بوڑھا ہو چلا تھا پلے درجے کا حرامی تھا۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ چند گھنٹے بیکری میں بھی کام کرواتا تھا۔ کم بخت بہت بھونڈ تھی۔ ایک دن چو پلے پر چھوڑ کے چل دیا۔ بہت دوڑی بھاگی مگر بھلا وہ ہاتھ نہ آنے والی رقم تھا۔ پینی کو حمل رہ گیا تھا۔ عاشق صادق کو معلوم ہوا تو ایک دم طائی کا لچھا بن گیا۔ حمل گرانے پر راضی کر لیا۔

"ڈارلنگ دن زیادہ چڑھ گئے ہیں۔ میرے گھر والوں کو پتہ چل جائے گا کہ شادی مجبوری کی ہے۔ جائیداد کا لفڑا کھڑا ہو جائے گا۔" ہسپتال میں یعنی جو خالص اس کام کے نجی ہسپتال ہوتے ہیں ڈھیر سارے پھول لے کر آیا پھر جس دن وہ واپس فلیٹ پر پہنچی تو پتہ چلا کہ وہاں تو کوئی اور ڈٹا ہوا ہے۔ عاشق صادق ایک دم غائب۔

"سالوتھ کینگٹن پہنچ کر عرفان میاں نے دوسری سگریٹ سلگائی۔ پینی پر ایسی جھگڑے کی کیا بات تھی۔ اس نے اتنی سردی میں سینر کو دھاک کرائی۔ یہ کم بخت سفید لوگ کتے بلیوں پر کیوں جان

دیتے ہیں۔ عرفان کی سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ ماں باپ بوڑھے ہو جائیں ترنت پنشن ہاؤس میں رکھ دیئے جائیں گے۔ مگر کتے بلیاں جب تک رنجھ رنجھ کر گود میں دم نہ توڑیں انہیں سینے سے لگائے روتے رہیں گے۔ بڑی شان سے جنازہ اُٹھے گا۔ سیزر کو شروع ہی سے عرفان سے کچھ سوتیا ڈاہ قسم کی شکایت ہوگئی تھی۔ نہایت بدذوق اور بدمزاج لیم شیم نسل کا کتا تھا۔ شجرۂ نسب کسی نہایت مرکھنے جنرل کے نہایت کٹکھنے گرے ہاؤنڈ سے جا کر اُلجھتا تھا۔ ممی کے کسی ویسٹ انڈین عاشق نے کبھی اُس کے لات جڑ دی تھی بس ایک دم کالی قوم کا بیری ہو گیا۔ اعلیٰ نسل کے کتوں کی یادداشت بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ بس ذرا سانولا رنگ دیکھتا اپنی بے عزتی کی یاد ٹیس مارتی اور نرخرے میں نفرت کا لاوا غرغرانے لگتا۔

عرفان نے سیزر کے معاملہ میں کتنے مورچے لڑے۔ سیزر نے کبھی کاٹا بھی نہیں مگر کبھی اس کا سانولا دوست بھی آجاتا تو فوراً کھانے کی میز کے نیچے گھس جاتا اور پیچھے سانس کھینچ کھینچ کر غراٹے بھرنے لگتا۔ عرفان کا خون کھولنے لگتا۔ سیزر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا جیسے دانت پیس پیس کر گالیاں دے رہا ہو۔

عرفان کا سر چکرا جاتا۔ کبھی سیزر اسی لہجے میں موٹی موٹی پنجابی میں مغلظات سنانے لگتا۔ اور قتل کی دھمکیوں پر اتر آتا۔

"کیا کر رہے ہو عرفی! ممی رو پڑتی۔

"وہ اس چنال کے پوت کی اماں بہنا کی...

"پلیز ڈنٹ، سیزر بہت حساس ہے۔"

" اور میں، جیسے تمہارے جوتے کی اپنی ایڑی ہوں۔ سالا، بہن کا یار میری سات پشتوں کو بکھان رہا ہے تو کچھ نہیں۔"

موڈ میں ہوتی تو ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔ اُس کی گود میں کود پڑتی۔ بیڈروم کی طرف گھسیٹ لے جاتی سینزر شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو کر دھائیں دھائیں بھونکتا رہتا۔

"قسم ہے ایک دن یہ حرامی میرا اسٹینڈ برباد کر دے گا۔"

تب پینی بیڈروم سے للکارتی "چپ ہو جاؤ ڈیر۔"

اور ڈیر سینزر منہ تھوتھا کے خاموش ہو جاتا جیسے کہہ رہا ہو۔

"کتوں سے بھی کھیلا کرو پرواہ نہیں۔"

"اصل میں یہ باسٹرڈ مدر کامپلیکس کا شکار ہے اس کی ماں بڑی لفنگی ہوگی۔ گلی کے کتوں سے فلرٹ کرتی ہوگی۔" انگریزی کی گالیاں نہایت چھن چھنی ہوتیں اور وہ پنجابی پشتو اور مادری اردو کی گالیاں اُگلنے لگتا۔

"ہرگز نہیں۔ سینزر نجیب الطرفین ہے۔ میرے پاس اس کا شجرۂ نسب موجود ہے۔" تب، پینی عرفان کے چھلکے چھڑا دیتی اور وہ غیری آٹے کا لوندا رہ جاتا۔

سب ہی پینی کو گوگلک میں ڈال کر کام چلاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی شبیہ مبارک سے آراستہ پینی کی طرح وہ گھوم پھر کر پھر دیں لوٹ آتی۔ نو سال گھسٹ گئے مگر نامراد انگریزی نہ آئی۔ کیونکہ کبھی فرانسیسی سے پالا پڑا کبھی میکسیکن کبھی ویسٹ انڈیز کا کل بھنوا پلے پڑ جاتا کبھی کوئی منچلا پٹھان، یا سردار جی مہربان ہو جاتا۔ کبھی اتنا پیسے ہوتی کہ اس کا گاہک دلال بن بیٹھتا اور باقاعدہ کیوں لگ جاتا۔

اگر ہوش آجاتا تو وہ دفعتہ میں سینزر کو پکارتی۔ اور آرام سے اس کے گلے میں باہیں ڈال کے سو جاتی۔ سینزر کی موجودگی میں کسی کو مجال نہ تھی جو پینی کو گوگلک میں ڈالنے کی جرأت کرتا۔ جب عرفان پینی سے ملا تو وہ اپنی انگلستانی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔

وہ دن بار بار یاد آتا تھا جب امی جان نے زمین کے دو ٹکڑے بیچ کر اس کا ولایت جانے کا انتظام کیا تھا۔ سیکنڈ ڈویژن میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک دم اسے انجینئرنگ کا شوق چرایا تھا۔ سارا خاندان ائرپورٹ پر جمع تھا۔ امام ضامنوں کے بوجھ سے اس کے ہاتھ نہ اٹھتے تھے۔ وہ اب وطن میں وقت برباد کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ وہ پہلا انسان جس نے خاندان میں ایم ایس سی کیا تھا دو سال بیچ میں کہیں ڈوب چکے تھے۔ مستقبل کو روشن بنانے کے لئے اسے کسی روشن ملک کی قدر دانی کی ضرورت تھی۔ بی ایس سی کے بعد کچھ نہ بنا تو ایم ایس سی میں کون سے لال جواہر جڑ جائیں گے۔ اپنے ملک میں انسان کی قدر نہیں۔ اس کے کئی دوست جو اس سے کہیں زیادہ نالائق تھے۔ انگلینڈ امریکہ یا کینیڈا مرگر چلے گئے اور وہاں ٹھاٹ کر رہے تھے۔ آخر جائیداد میں کچھ اس کا بھی حصّہ تھا۔ اگر والد صاحب بس آنے جانے کا کرایہ دے دیں تو وہ اپنے جملہ حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔ پھر جب والد صاحب اچانک دل کے دورے میں ختم ہو گئے تو اماں نے اس کی دلی آرزو پوری کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ کیا۔

"اگر کام نہ بنا تو؟" بڑے بھیا نے کہا تھا۔

"بڑے بھیا کام نہ بننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا جب یہاں کچھ تیر نہ مار سکے تو۔۔۔!"

"یہاں کوئی انسان ترقی نہیں کر سکتا! اور پھر میں اپنا حصّہ ہی تو لے رہا ہوں۔ تھوڑا اماں جان کا بھی!"

چھپلا ندے کمرے میں دم گھٹنے لگا۔ سینئر میز کے نیچے سے غرغرا رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ چرچراتی سیڑھیوں پر سے اتر کر وہ باہر آگیا تھا۔ اور اب یخ بستہ زمین پر اس کے تلوے سنگ رہے تھے۔ بلیبی کے قدموں کی چاپ کا انتظار کچھ کھوکھلا سا لگ رہا تھا۔

یہ پینی کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی ملاقات جو سے ہو گئی تھی۔ چھ فٹ چار انچ لمبا اور سڈول جسم والا جو بھی کسی گھبیلے در گھبیلے کی پیداوار تھا۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں جیسے کوئلے جیسا چمکتا رنگ عربی عقابی ناک ٹھوڑی میں گہرا گڈھا۔ مگر سب سے نرالے تھے اس کے بال سُرخی مائل ہلکے گہرے گھنگھریالے بال۔ جو ایک نظر ڈالتا بھنور میں چکر کھانے لگتا۔ پانچ فٹ چھ انچ کے مسٹر ولیم کی آخر میں فتح ہوئی۔ انہوں نے اُسے گود لے لیا۔ گزشتہ نوجوانوں کو کہیں اور ٹھکانے لگا دیا۔ ود کو تو اپنے ایک پرانے دوست کے پاس امریکہ کے پاس بھیج دیا۔ وہ ریس کے گھوڑوں کی پال پوس کرتے تھے۔ ایک تگڑے کابل الوجود کی تلاش تھی۔ ود کو کہیں مڈل ایسٹ میں چپکا دیا۔ جو کہ ان کے انتقال کے بعد یہ تین منزلہ عمارت ورثہ میں ملی۔ نیچے وہ خود رہتا تھا۔ دوسرے مالے پر دو کرائے دار اور تیسرے چھوٹے سے فلیٹ میں ایک نیم پاگل آرٹسٹ رہتا تھا۔ دوسرے مالے سے ایک دن آدھی رات کو پینی کے گاہک نے لات مار کر نکال دیا۔ باہر جھڑی لگی تھی اور جو کا ڈبل بیڈ گرم تھا۔ اگلے دن ہفتہ اور اتوار تھا۔

صبح جو پینی کو اپنے ڈبل بیڈ پر پھیلا دیکھ کر یادداشت کی پوٹلی کریدنے کے بعد کندھے اُچکا کر نہانے چلا گیا۔ باورچی خانہ میں پینی کافی چڑھا کر سنہری توس اور انڈے تل رہی تھی۔ کچھ زیادہ بات نہیں ہوئی اور گنجائش بھی نہیں تھی۔ پینی نے اس کا بڑا سا سویٹر پہن رکھا تھا اور جام لگا کر مچھری چاٹ رہی تھی۔

پتہ نہیں یہ ادا جو کو کیوں بھا گئی۔ اُس نے دو پونڈ کے نوٹ میز پر ڈالے اور فلیٹ کی چابی سامنے پھینک کر چلا گیا۔

کب کے بھولے بھٹکے مسافر کسی اسٹیشن پر مل جاتے ہیں۔ بٹن کاج میں بیٹھ جاتا ہے۔ لمبا سفر دھیمے دھیمے چلنے لگتا ہے۔

زندگی میں پہلی بار پیٹی کو گھرداری کا لُطف اٹھانے کا موقع ملا۔ جز کو کچھ فرق محسوس نہ ہوا۔ وہ بنی سرگوکلک میں فٹ ہونے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ انتیس سال کی تھی اور کلرکی کے قابل بھی انگریزی نہیں سیکھ پائی تھی مگر شاید ہی کوئی زبان ایسی ہوگی جو اس کی سمجھ بوجھ سے بالکل ہی باہر ہو۔

مکان کی صفائی سودا سُلف، کپڑے لانڈرٹ میں سے جانا لانا بے تکلفی سے لورپول کے بازار سے اپنے لئے بھی جو جی چاہے خرید لیتی۔ جو نے کبھی اس سے حساب نہیں مانگا۔ جب پیسے مانگے پیٹی نے فوراً حاضر کر دیئے۔

جب وہ اسے چھوڑ کر جانے لگا تو رو پڑا۔ اس نے عمارت اس کے نام کر دی کہ جب وہ بلائے تو بیچ کر چلی آئے۔ جہاں بھی جب بھی۔ اتنی محبت تو اُس کے والدین نے بھی کبھی نہ دکھائی تھی۔ اور اس طرح عرفان اس کا کرایہ دار سے ایک طرح کا گھر والا ہو گیا۔

پردہ دار ماحول کا عادی، گوری لڑکیوں کی دلدل میں گلے گلے پھنس گیا۔ پہلی دفعہ جب اس کی پہلی محبوبہ اس کے عزیز ترین دوست رازداں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کے ٹرپ پر چلی گئی تو وہ رقیب روسیاہ کے ساتھ اُسے بھی جہنم واصل کرنے کے پلان بناتا رہا۔ مگر ایک دن جب وہ روتی پیٹتی لوٹی اور اس کے سینے پر دھڑام سے گر کر سا نا منڈ کھانے کے پلان بنانے لگی تو اُسے اس پر رحم آ گیا تھا۔ وہ بھی غضب کی طرح دار۔ عرفان کو اس سے عشق ہو چلا تھا۔ وہ جہاں کام پر جاتی بلڈنگ کے سامنے فٹ پاتھ پر ٹہلا کرتا۔

ایک دن وہ کسی کے ساتھ ہنستی ہوئی نکلی اور اس سے پہلے کہ عرفان پہنچتا وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر آناً چھو ہو گئی۔ عرفان کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ قریب دو بجے لوٹی اور گھنٹوں موٹر میں بیٹھی اس سے اختلاط کرتی رہی۔ عرفان دیوانہ وار کوٹ پہنے نکل پڑا، دروازہ کھول کر اس نے لڑکی کو گھسیٹ لیا۔ موٹر فراٹے بھر گئی۔ آس پاس کی عمارتوں میں چیخ پکار سن کر کھڑکیاں

روشن ہو گئیں۔ سہم کر دونوں اندر بھاگ گئے۔

"بات کیا ہے۔ کیا بہت پی لی ہے؟"

"تم اس حرامزادے کے ساتھ....." عرفان مارے غصہ کے پاگل ہو رہا تھا۔

"کون حرامزادہ؟ وہ میرا بوس ہے ایڈیٹ دفتر کا کچھ کام تھا وہ...."

"یہ رات کے دو بجے تک تم دفتر کا کام کر رہی تھیں؟"

"احمق نہ بنو، ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد اس کے گھر..... اس کی بیوی بچے سمندر کے کنارے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے کافی بنائی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"دو بجے تک۔ وہ حرامزادہ، میں اس کا سر توڑ دوں گا۔"

"وہ میرا بوس ہے بڑا پیارا آدمی ہے۔"

"اس لئے تم..... ایک شادی شدہ آدمی کے ساتھ...."

"احمق نہ بنو، مگر تم ہوتے کون ہو حکم چلانے والے۔ ایڈیٹ۔"

عرفان کا خون کھول رہا تھا۔ مگر لڑکی کھانے کی میز کے اُدھر تھی۔ کئی بار جی چاہا میز پر چڑھ کر دبوچ لے اس کا گلا۔

"میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" عرفان نے بھرے گلے سے کہا۔

"اوہ آئی ایم سوری ڈیئر۔"

"تم..... تم مجھ سے شادی کر لو..... کل صبح۔"

"اوہ، بند کرو بکواس۔"

"شادی کو تم بکواس کہہ رہی ہو؟ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"تب تو تمہیں مرنا پڑے گا پیارے اس کے علاوہ تمہارے وطن میں جو تمہاری منگیتر انتظار کر رہی ہے۔"

"وہ، کوئی منگیتر نہیں، میری ماں اور بھائی بہت میرے پیچھے پڑے ہیں۔ بہت سی لڑکیوں کے پیغام آ رہے ہیں میرے لئے۔ مگر میں انہیں لکھ دوں گا کہ میں نے یہاں شادی کر لی ہے۔"

"اچھا تم یہاں شادی کر رہے ہو۔ مبارک ہو۔ میں بھی اگلے ایسٹر پر جا رہی ہوں اپنے بچپن کے محبوب سے شادی کرنے۔ اس کا خط آیا ہے کہ اس کی پریکٹس اچھی چل رہی ہے ڈاکٹر ہے۔ میں یہاں نرسنگ سیکھنے آئی تھی۔ تمہاری منگیتر۔"

"میں نے کہا نا میری کوئی منگیتر نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور۔۔۔۔"

"شکریہ بہت بہت شکریہ مگر تمہیں اپنا پروگرام بدلنا پڑے گا۔"

"تمہارا منگیتر تم سے شادی کرے گا۔ یقیناً وہ اتنا ذلیل نہیں ہوگا کہ تم جیسی آوارہ، بدمعاش عورت سے شادی کرے جو ہر مرد کے ساتھ۔۔۔۔"

"ایک، ایک منٹ مسز۔ کیا مطلب آپ کا؟"

"اُسے معلوم ہوگا کہ تم۔۔۔۔ تم۔۔۔۔"

"ہاں، ہاں بولو۔۔۔ شرماؤ نہیں۔"

"تم بے حیا ہو، رنڈی ہو، بدکردار۔۔۔۔"

"مگر کیوں؟"

"تم ہر مرد کے ساتھ۔۔۔۔"

"ڈونٹ بی سلی۔ جانتے ہو میری عمر اٹھائیس سال ہے بلکہ اکتوبر میں انتیس کی ہو جاؤں گی؟"

"میں بھی پچھلی جولائی میں اکتیس برس کا ہو گیا ہوں۔"

"میرا منگیتر تم سے دو سال بڑا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ کیا وہ میرے انتظار میں اب تک کنوارا بیٹھا ہے؟ کبھی کسی دوسری عورت کی طرف نہیں دیکھتا؟"

"مگر وہ مرد ہے۔۔۔۔"

"یہ تو مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔" وہ زور سے قہقہہ مار کر دیوان پر اوندھی لیٹ گئی۔

"ڈاکٹر ہے نا سب اونچ نیچ جانتا ہے۔ گاؤں کا معاملہ ہے۔ تھوڑی پریکٹس چل نکلے تب ہی ہم شادی کر سکتے ہیں۔ مجھے زننگ کا موقع نہیں ملا۔"

"وہ تمہیں معاف کر دے گا۔"

"کیا معاف کر دے گا؟"

"یہی جو تم یہاں دوسرے مردوں کے ساتھ گل چھرّے اڑاتی ہو۔"

"تو کیا وہ وہاں سادھو رمائے بیٹھا ہے۔ تندرست ہے۔ جوان ہے۔ بڑی محنت کرتا ہے۔"

"اگر اسے پتہ چل جائے کہ یہاں تم غیر مردوں کے ساتھ بے شرمی سے گل چھرّے اڑاتی ہو تو۔۔۔"

"پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ بار بار ایک ہی بات۔"

"وہ کچھ نہیں کرے گا، ہمارے یہاں فوراً شوہر بیوی کی ناک کاٹ لے گا۔ تمہارا منگیتر۔۔۔۔"

"او مائی گاڈ حد سے بے رحمی کی۔ اور بیوی میاں کو کسی دوسری عورت کے پہلو میں پکڑ لے تو۔۔۔۔ وہ بھی ناک کاٹ لے گی؟"

"نہیں ایسا کبھی نہیں سنا۔ قتل تو کر دیتی ہیں عورتیں۔"

"ناک کاٹنا نہایت غیر مہذب فعل ہے، ہاں قتل تو میں بھی کر سکتی ہوں۔"

"اگر تمہارا ڈاکٹر تمہیں کسی کے ساتھ پکڑے تو؟"

"ڈاکٹر ذرا کاٹ چھانٹ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہاں سائنایڈ وغیرہ ضرور دیدے گا"

"تو پھر تمہارے منگیتر کو پتہ چل جائے کہ تم یوں غیر مردوں کے ساتھ بے شرمی..."

"اے مسٹر، تم عجب بونگڑ ہو اگر میرے منگیتر کو معلوم ہو جائے کہ میں یہاں اتنے سال سے بیٹھی اس کی یاد میں سوکھ رہی ہوں تو اس کے ارسان خطا ہو جائیں گے۔ میں نورمل نہیں ہوں کوئی جسمانی نقص ہے یا نفسیاتی ٹیڑھا پن ہے۔ ایک ۲۹ برس کی عورت تین سال سے بغیر جسمانی پیار کے جی سکتی ہے۔ تو وہ ضرور ذہنی مریض ہے۔ تب تو وہ ہرگز مجھ سے زندگی بھر کا سودا نہیں کرے گا۔"

"کمال ہے" عرفان چکرا گیا۔ "لاحول ولا، میں تو ایسی لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلے گا؟"

"چل جاتا ہے پتہ، کنواری اور فاحشہ کا فرق" عرفان مسکرایا۔

"مگر میں نے سنا ہے بازاری عورتیں ایک ترکیب سے..."

"میں کسی بازاری عورت سے شادی نہیں کروں گا" عرفان نے جملہ کاٹا۔

"مگر بڑی کارگر ترکیب ہوتی ہے پاس پڑوس میں تجربہ کار..."

"اچھا بکواس بند کرو" عرفان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بھیا جی نے کئی تصویریں لڑکیوں کی بھیجی تھیں کہ ان میں سے کسی کو پسند کرلے۔ اب وہ ہرگز کسی کو پسند نہیں کرے گا۔ پڑوس کی تجربہ کار عورتیں.... اُف خدایا، سر گھومنے لگتا ہے۔

"مگر تم تو کہتے تھے بیوہ سے شادی بہت — یعنی بہت اچھی بات ہے"

"بیوہ کی اور بات ہے۔ وہ تو کارِ ثواب ہے"

"مگر میں تو نہ بیوہ ہوں نہ کنواری ہوں تم سے کیسے شادی کر سکتی ہوں!"

تب ہی عرفان بھنا کر پیر پٹختا ٹیوب اسٹیشن کی طرف چل پڑا تھا۔ اور اب اس کا جسم سردی سے جما جا رہا تھا۔ پیر جیسے غائب ہو چکے تھے۔ اگر کوئی پولیس مین اُسے دیکھ لے تو مزدور پکڑ کے بند کر دے گا۔

مگر وہ اس قحبہ کے پاس واپس نہیں جا سکتا۔

پھر کہاں جا سکتا ہے!

کئی ماہ سے اُس کے گھر سے روپیہ آنا بند ہو گیا تھا۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ وہ ولایت میں ٹھاٹ کر رہا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ وہ کنگال ہو چکا تھا۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کیں، بسکٹ کی فیکٹری میں راج مزدور کا کام کیا۔ پارٹ ٹائم اسٹور میں چپکا رہا۔ ہاتھ ہمیشہ سے کھلا ہوا تھا۔ یار دوستوں سے اتنے قرض لے چکا تھا کہ کسی کے پاس جانے کا بھی منہ نہ رہا تھا۔

اس شاندار ملک میں، ولایت میں وہ کنگال تھا۔ قابلِ یقین بات نہیں تھی۔ اُسے اتنی شدید محنت کی کبھی عادت نہ تھی۔ پینی کے سہارے نے اُسے اور بھی نکما کر دیا تھا۔ کیوں جھیلتی تھی اُسے۔ مردوں کا سہارا غنیمت ہوتا ہے۔ مگر وہ تو خود اس کا سہارا تھی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مزدر کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ زندگی میں جھول بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ گھر خط لکھنے کی ہمت نہیں کرے گا بھی کیا اب گھر جا کے۔ کالے تو کالے گوروں کی بھی کچھ کھسکی ہوئی حالت تھی۔ روز کاٹنے گوروں میں جھپٹیں ہو رہی تھیں۔ یہ تو دیارِ غیر تھا، وطن سے نئے نوجوانوں کے خوشامد بھرے خط آ رہے تھے۔ ٹکٹ بھیج دو تو ہم بھی آ جائیں۔ ڈول یعنی بے کاری کا معاوضہ کھینچ تان میں نکل جاتا ہے۔ اس نے دو تین بار زمین پر پیر پٹخے اور لوٹ پڑا۔

چوروں کی طرح جب داخل ہوا تو سیزر پینی کی پائنتی لیٹا خراٹے بھرنے لگا۔

"ڈارلنگ!" پینی کی ننھی سی کانپتی ہوئی آواز کلیجہ چیر کر دجود میں اُتر گئی۔ بیسز دھیرے سے اُتر کر میز کے نیچے جا بیٹھا۔ پگھلی ہوئی پینی کو عرفان سے زیادہ سمجھتا تھا۔

"بڑی سردی ہے ڈارلنگ۔ یہ منحوس بجلی کا کمبل کسی کام کا نہیں۔ سب وائرگل سڑ گئے ہیں مائیکل نے اس ویک کا کرایہ بھی نہیں دیا۔ جی چاہتا ہے حرامزادے کا سامان باہر پھینک دوں مگر اتنی سردی ہے کہاں جائے گا بڈھا۔ اوپر گئی تھی شراب میں دھت ناچ رہے تھے تینوں وہ عورت بھی ابھی تک اوپر ہی ہے کیا بھتنی کی طرح چنگھاڑیں مار کر ہنس رہی ہے۔ کم آن ڈارلنگ۔ غضب کی سردی ہے آج تو"

پینی بڑبڑاتی رہی۔

جب پینی سو گئی تو عرفان اس کے نرم گرم سینے میں منہ دے کر دیر تک لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا، جو سسکیوں میں اُلجھ گئیں۔

وضاحت

"دوزخی کا بھوت" اشاعت کے لئے بھیجا گیا تو جناب حنیف رامے صاحب ایڈیٹر سویرا لاہور نے اپنی طرف سے کچھ فٹ نوٹس تحریر کئے اب کتابی صورت میں اشاعت کے وقت بھی وہ فٹ نوٹ دئے جا رہے ہیں تاکہ فریقین کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے۔

"ادارہ"

دوزخی کا بھوت

مکرمی منیف صاحب۔ نصیر انور کے مضمون "موج سراب" سے پہلے جو آپ نے نوٹ تحریر فرمایا ہے اُسے پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ جو ہیولا آپ نے منٹو کا بنایا ہے بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے منٹو کو اس کے افسانوں کی دوربین لگا کر دیکھا ہے۔ دوربین خوردبین نہیں۔ منٹو نہ دیو تھا نہ بونا، وہ اچھا بھلا انسان تھا۔ اسے کسی پر بھوت بن کر چڑھنے کی عادت نہ تھی، ہاں جو لوگ اس سے دہشت زدہ ہو جاتے تھے وہ اُن پر واقعی چڑھ بیٹھتا تھا۔ یہ کون نہیں کرتا۔ احمق قسم کے دیو دوستوں کو سب ہی دباتے ہیں یہ کوئی اتنی عجیب بات نہیں اور ضروری نہیں کہ ایسا کرنے والا انسان دیو جن کی صف میں کھڑا کر دیا جائے[1]

---

[1] یہاں سوال لوگوں سے دینے یا ان پر چڑھنے کا نہیں۔ دیو اور بونے کے استعارے سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا اصل مقام ملاحظہ ہو۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰ پر)

منٹو کے متعلق جتنے مضامین نکل رہے ہیں انہیں دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو منٹو دیکھا تھا، جس کے ساتھ کئی سال اٹھنا بیٹھنا رہا تھا وہ کوئی اور تھا اور یہ منٹو صرف اُس کے افسانوں سے جھٹکا کھائے ہوئے دماغوں کی افترا ہے۔ زیب داستاں کے لئے لوگ اس کے چند عیوب لے کر دھول اُچھال رہے ہیں۔ منٹو کی پرائیوٹ زندگی کو اس کی افسانوی زندگی میں لتھیڑ کر اُسے خود ایک افسانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ہی رُخ اٹھا کر اس پر مضمون نگاری فرمائی جا رہی ہے۔ یہ عمل لکھنے والوں کے لئے چٹخارا رکھتا ہو مگر منٹو کے ساتھ قطعی انصاف نہیں[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹ سے آگے)

حواس خون کے تابع ہوتے ہیں۔ خون میں صداقت ہے لیکن دھوپ اور چاندنی (حکمت و تخیل) میں بھی تو صداقت ہے۔ منٹو صاحب نے اپنے آپ کو حواس تک محدود کر لیا کہ اس طرح وہ اپنے ہم عصروں میں دیو کی حیثیت رکھیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ارد گرد بونے بستے ہیں۔ جنہیں حواس پر بھی اختیار نہیں۔ حکمت و تخیل کا راستہ اپنے اوپر حرام کر لیا کہ اس طرح وہ عالمین میں بونے کی حیثیت رکھیں گے، وہ یہ بھول گئے کہ جو شخص دیو سے بونے اور بونے سے دیو میں قلب ہیئت کر سکتا ہے وہ ان لوگوں کے مقابلے میں صاحب اختیار ہے جو محض بونے یا محض دیو ہو کر رہ گئے ہیں۔

[1] زیر تبصرہ مضمون منٹو صاحب کی پرائیوٹ زندگی سے متعلق ہرگز نہیں، یہ تو ان کے ذہن کا جائزہ ہے اور ان کی تحریریں اُن کے ذہن کے بارے میں سب سے معتبر رہبر ہیں۔ باقی رہا

منٹو کے ہاں ہر مال بکاؤ نہ تھا۔ دوستی محبت تکریم اور رازداری اس نے کہیں بھی ان اصناف کو کوڑیوں کے مول نہیں بیچا۔ یہ بھی بہتان ہے کہ کسی قدر کی اسے قدر نہ تھی۔ جب میں نے منٹو کو دیکھا تو اس کے ہاں زندگی کی تمام قدریں زندہ تھیں۔ وہ چھچھورا بھی تھا اور بردبار بھی۔ جھوٹا بھی تھا اور صاف گو بھی، اس کے ہاں ترشی بھی تھی اور مٹھاس بھی۔ یہ سراسر غلط ہے کہ اُسے اپنی ذات کے سوا کسی کے لئے ذمہ داری کا احساس نہ تھا۔ خدا کے لئے اُسے زندہ نہ بنایئے۔ منٹو اتنا پیارا باپ تھا گو دنیا کے اور بہت سے باپوں کی طرح شراب کے چکر میں اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں مگر اور باپوں کی کوئی کھال نہیں آدھیڑتا۔ منٹو میں انا تھی اور ہر فنکار اور ذی حس میں انا ہوتی ہے۔ مگر یہ کہہ دینا تو زیادتی ہے کہ اس نے انا ہی کی پرورش کو مقصد زندگی جانا۔ اور ہر قدر اور ہر موقع انہوں نے انا کی بھینٹ چڑھا دیا۔ مکھی کو مل مل کے بھینسا بنانا اسی کو کہتے ہیں۔ اس نے کسی بھی نعمت کو سولی پر نہیں لٹکایا اور نہ ہی وہ جان بوجھ کر خود سولی پر لٹکا۔ شرابی کا جو انجام ہوتا ہے وہی اس کا انجام ہوا۔ اتنی ذرا سی بات کو تمام جھام لگا کر بڑھا دینا۔ واقعات کی صورت مسخ کرنا ادیبوں اور فنکاروں کا کام نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰ سے آگے)

ذاتی زندگی تو کس نے انہیں اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ آپ نے بھی ان کا ایک ہی حصہ دیکھا ہے جو ان کا "شباب" تھا۔ میں نے تو ان کی پختگی اور انجام دیکھا ہے۔ میں نے تو انہیں ڈوبتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایسے عالم ہی میں انسان کسی منظر کو اپنی نگاہ میں مجسم کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے کیونکہ اُسے علم ہوتا ہے کہ اس منظر کو پھر نہ دیکھ سکے گا۔ (راوی)

آگے تو آپ نے منٹو کا حلیہ اور بھی مسخ کر دیا ہے۔ آپ کا اس جملے سے کیا مطلب ہے کہ "انہوں نے اپنی سیڑھی زمین کے قلب کی طرف لٹکا دی اور نیچے ہی نیچے اُترتے چلے گئے تاکہ ہر شے کو اُوپر سے دیکھیں اور اُسے کم تر سمجھیں" یہ اُوپر نیچے کے قصّے میں کچھ گھپلا ہو گیا۔ ویسے دیکھنے میں جملہ بڑا پُر مغز معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے پڑھیے تو آپ جس جڑ پر پاؤں رکھتے ہیں اُسی کو کاٹ دیتے ہیں۔ یہ کیا کہ نیچے ہی نیچے اُتر کر سب کو اُوپر سے دیکھنے لگا۔ وہ کیسے؟[1]

یہ بھی غلط فرماتے ہیں کہ منٹو کو زمین سے اتنی ہی واقفیت تھی جتنی سانپ کو ہوتی ہے۔ اوّل تو قبلہ آپ نے کبھی سانپ سے انٹرویو میرے خیال میں نہیں لیا آپ کو اس کی واقفیت کا اندازہ کیسے ہوا؟[2] اگر میں کہوں کہ منٹو کے متعلق لوگوں کو اتنی ہی معلومات تھی جتنی گدھوں کو لاش سے ہوتی ہے تو آپ کیا سمجھیں گے۔

میں پوچھ سکتی ہوں انسانیت کا وہ کون سا بے کراں راستہ ہے جسے منٹو نے حرام کر لیا تھا اور ہم سب آپ اور میں اسے حلال کیے بیٹھے ہیں۔ شراب ہی تو پیتا تھا[3]۔ ذرا انگلیوں

---

[1] ایسے کہ "انہوں نے اپنی انا کی سیڑھی کا رُخ زمین سے آسمان کی طرف نہ رکھا۔ اس طرح جہاں انہیں قوت کا احساس ہوتا وہاں کم مائگی کا احساس بھی ہوتا۔

زمین ہمیشہ سے وجود کی جانی بوجھی اور نچلی سطحوں کی اور آسمان ان جانی ارفع سطحوں کا اسم ہے۔

[2] ایک چیز دیومالا ہوتی ہے۔ اگر یہ لفظ خوفناک ہے تو ایک چیز علم حیاتیات ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی قابلِ اعتماد ہے تو سانپ کا لفظ گالی ہرگز نہیں۔

[3] زیرِ تبصرہ مضمون میں شراب کا صرف ایک جگہ داد دین میں ذکر ہے۔ فقرہ ملاحظہ ہو "شراب انہیں کہیں زیادہ بیدار کر دیتی تھی"۔

پر گنے کتنے لوگ شراب پیتے ہیں۔ کیا وہ سب منٹو ہی بن گئے ہیں۔ کیا ان پر بھی آپ یہی لیبل چسپاں کر دیں گے۔

حکمت اور تخیل کو گھر نکالا دے دیا۔ جملہ بڑا چست ہے مگر ماروں گھٹنا اور پھوٹے آنکھ والا قصہ نظر آتا ہے[1]۔ اسی طرح ماضی اور حال کی اسیری سے بے علاقہ ہونا بھی دھاندلی معلوم ہوتی ہے۔ کیا مطلب ہے آپ کا منٹو نے کوئی پیش گوئی نہیں کی۔

اور سب سے غلط جو بات آپ نے فرمائی وہ یہ ہے کہ "ان کی زندگی میں جتنی دلچسپی اُن کے افسانوں میں لی گئی موت کے بعد ہرگز نہ لی جائے گی۔ کیونکہ حواس ماضی اور حال کی نبض تو ٹٹول سکتے تھے مستقبل پر کمند نہیں ڈال سکتے تھے۔" چہ خوش یعنی شیکسپیئر نے کون سی مستقبل کی گردن پھانسی ہے[2]۔ اور کون ہے جو اس کرتب کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ہم ادیب ماضی کے سہارے حال کو لے کر چلتے ہیں، ہر مستقبل حال میں سرکتا آتا ہے۔

یہ غلط ہے کہ منٹو دوسروں کو بونا سمجھتے تھے۔ شاید اُن کے گرد بونے اُنہیں دیو سمجھنے لگے ہوں۔ یہ بونوں کا قصور ہے نہ کہ اس انسان کا جسے وہ دیو سمجھ بیٹھے[3]۔ منٹو دبنگ طریقہ پر بات کرتا تھا معمولی دماغی طاقت کے لوگ سہم جاتے ہوں گے اس سے یہ مطلب تو نہیں

---

[1] کیا اسے ذلیل سمجھا جائے۔

[2] شیکسپیئر نے یہی کیا تھا کہ حواس کے علاوہ حکمت و تخیل سے بھی کام لینا باعث ننگ نہ جانا تھا۔

[3] افسوس بونوں نے انہیں ان کی زندگی میں دیو نہ سمجھا۔ ورنہ شاید منٹو صاحب دنیا سے اتنے مایوس و نامراد نہ جاتے ــــ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

کہ وہ اپنے کو ولی سمجھتا تھا۔ نہ ہی وہ بے چارا ہر شے پر محیط تھا۔ اور نہ زندگی میں کوئی ہم آہنگی کی کمی ہوتی اگر اسے بجائے ٹھرے کے وہسکی ملتی رہتی اور ذرا کوئی سخت گیری کرتا تو وہ اتنی جلدی نہ مر جاتا۔[1]

یہ آپ سے کس نے کہا کہ انا کی بادشاہی کا خاتمہ ہو رہا ہے؟ صاحب ایسے احکامات سنانے سے پہلے یہ سوچئے کہ آپ کتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں[2]۔ انا[3] اگر منٹو ہی میں تھی اور آپ کا خیال ہے کہ اس کے جراثیم ختم ہو چکے تو یہ غلط ہے۔ انا کسی کی مٹھی میں سمانے والی شے نہیں۔ اور نہ کسی انسان میں اگتی ہے اور نہ ایک ڈبیہ میں بند کر کے دفنائی جا سکتی ہے۔ نہ ہی یہ فوج لٹی لٹائی ہے اور اکیلا منٹو اس فوج کا کمانڈر نہیں تھا۔ میں نہ جانے کتنے دوستوں کو جانتی ہوں جو حالات زمانہ کے ہاتھوں کھسکتے ہوئے قدم بہ قدم منٹو کے راستہ پر جا رہے ہیں۔ جنہیں شراب نے مربہ بنا ڈالا ہے، جو وہسکی نہیں پی سکتے تو موری کی غلاظت پیتے ہیں اور موری میں گر پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے ان سے وہ کام کیسے ہو سکتے ہیں جن میں تمام تر حواس کے چاق و چوبند ہونے کی ضرورت ہے۔ پھر انہیں موری کی غلاظت بھی نہیں ملتی۔ اور وہ اپنی سیڑھی نیچے سے نیچے اتارتے جاتے ہیں۔ یہ بہت پھیلا ہوا مرض

---

[1] نہ منٹو نے کبھی ٹھرا پیا اور نہ سخت گیری ہی کی کمی تھی۔ اس سخت گیری کے احساس ہی نے اس کی انا کو بھڑکایا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں۔

[2] کیا بڑی بات کہنا جرم ہے؟

[3] انا نہیں انا کی بادشاہی کا ذکر تھا۔

ہے اُسے منٹو کے سر نہ تھوپیے۔ منٹو کے بعد جو اس کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں قصے بنائے جا رہے ہیں۔ بالکل لطیف نہیں معلوم ہوتے۔ آپ اُس کی تحریروں کو چھوڑ کر اس کی نجی زندگی کی دھجیاں اُڑا رہے ہیں اور وہ بھی اس کے مرنے کے بعد[1]۔ زندگی میں ان بونوں کو اُس دیو پر اُنگلی اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، اُس کے مرتے ہی سب بلوں میں سے نکل پڑے۔ یہ بزدلی اور چھوٹا پن ہے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو کیا کسی کی ہمت ہو سکتی تھی کہ یوں اُس کے پرزے اُڑائے جاتے۔ اس کے سامنے تو سب لرزتے رہے اب مری ہوئی بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے دوڑ پڑے۔ آخر مرنے والے کی بھی عزت ہوتی ہے۔ اس کا احترام بھی تو ہم پر لازم ہے[2]۔

---

[1] ذکر شرابیوں کی فوج کا نہیں تھا۔ ذکر تو ذہن کی ایک قسم کا تھا۔ پھر زیر تبصرہ مضمون میں کہیں ان کی نجی زندگی کو ننگا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگر کوئی بات کی بھی ہے تو ملاحظہ ہو منٹو "یہ کردار اتنا بڑا تو یقیناً ہے کہ کوئی فنکار اس کی مدد سے انا کے شہیدوں پر کوئی بڑا ناول لکھے۔ لیکن یہ فنکار یہ کام مزدور کرے کہ منٹو کی زندگی کی تفاصیل کے قلب ہیئت کی کوشش کرے تاکہ یہ ناول سیکنڈل کے دائرے میں گھٹ کر نہ رہ جائے"

[2] "انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اصول مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے جاتے ہیں۔ اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ ویسے میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور شخص لانڈری میں بھیج دیا جائے۔ جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے" (اقتباس از "گنجے فرشتے" سعادت حسن منٹو)

اس کی زندگی میں دھجیاں اُڑائی ہوتیں تو شائد وہ سہہ بھی لیتا۔ یہ مزدے کو انجکشن کیوں دیئے جارہے ہیں۔ کیا خیال ہے وہ جی اُٹھے گا۔[1]

خدا کے لئے منٹو پر یہ آزار پہنچانے والے مضامین بند کر دیجئے۔ اس کے بچوں پر رحم کیجئے۔ اُن کے دلوں پر ایک دیو کی پرچھائیں نہ ڈالئے۔ وہ اپنے باپ کی شکل آپ کے بنائے ہوئے آئینے میں دیکھ کر دہل جائیں گے۔

---

[1] انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں عقل چاہیئے ان چیزوں کے لئے۔۔۔"

"انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے! یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا۔ عموماً پیسے دے کر دھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔"

"میں نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے۔ اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے "کچھ نہیں، قانونی کتاب ہے۔"

"یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؓ کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔"

عصمت چغتائی نے اپنے مرحوم بھائی عظیم بیگ چغتائی پر "دوزخی" لکھا۔ جس میں بار بار جتایا کہ وہ بہن اور عورت کی حیثیت سے نہیں انسان کی حیثیت سے یہ باتیں لکھ رہی ہیں۔ منٹو تو میرا بھائی بھی نہ تھا، پھر مجھے سچ بولنے میں کیوں عار ہو۔ (اقتباس از "دوزخی" عصمت چغتائی)

میں نے منٹو کو بڑے انسانیت کے روپ میں دیکھا ہے۔ منٹو اور صفیہ دو بالکل نارمل میاں بیوی تھے۔ اچھی آمدنی تھی۔ بڑھیا وہسکی وہ ہر شام کو مناسب مقدار میں پیتا تھا۔ گھر بار صاف ستھرا نفیس۔ مہذب قسم کا مجمع رہتا تھا۔ ہماری آئے دن کی ملاقات ہوتی رہتی تھی میں نے منٹو کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ دیو کے سینگ کہیں نظر نہ آئے۔ اس کے جملوں میں شرارت ہوتی تھی۔ بڑی گندی باتیں سادگی سے کہہ دیتا تھا۔ عریانی پر اتر آتا تھا۔ ڈینگیں مارتا تھا۔ یہ سب ہی کرتے ہیں۔ اگر منٹو دیو تھا تو کرشن بھوت ہوا، سردار جعفری پریت ہے۔ جوش صاحب ہوا ہیں۔ جگر صاحب آسیب۔ نہیں صاحب ہم سب انسان ہیں۔ بڑے پیارے، بڑے حساس۔ ہمارے دلوں میں سارے جہاں کا درد ہے۔ ہمیں اپنے بچوں سے پیار ہے اُن کی اُمنگوں بھری زندگی سے پیار ہے۔ منٹو کے دل میں بھی دنیا بھر کے لئے پیار ہے۔ وہ گندگی کو کریدتا تھا نہ اس لئے کہ اُسے گندگی سے پیار تھا۔ بلکہ اس کی ناک زیادہ تیز تھی۔ اور وہ کندناکوں کو جگانا چاہتا تھا۔ جتنے افسانے منٹو نے "میں" کی طرف سے لکھے ہیں۔ اُنہیں منٹو پر ہی نہیں تھوپ دینا چاہیئے۔ اس نے کسی کی بیتی "میں" بن کر محسوس کی ہے۔ اُسے اُس کے افسانوں میں نہ لپیٹ دیجئے۔ انسان کو انسان رہنے دیجئے۔ کتا بچہ نہ بنایئے۔ اگر کوئی منٹو کے دل میں بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا تو کیا ضرور ہے کہ اس کے چند جملوں کو پکڑ کر آپ اس کا ہیولا بنا دیں۔ آپ تو خود فنکار ہیں کیا آپ کو کسی کے نقش بناتے وقت صرف کاغذ اور رنگوں اور ایک پرچھائیں کی ضرورت ہوتی ہے۔ روح کی ضرورت نہیں ہوتی[1]

---

[1] ہوتی تو ضرور ہے لیکن یہی تو میں عرض کرتا رہا کہ منٹو صاحب کے نظام میں اس کے لئے جگہ نہ تھی، وہاں تو محض حواس کارفرما تھے۔ (راوی)

احساس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

آخر میں عرض ہے کہ اگر کچھ ناگوار باتیں بھاگ دوڑ میں لکھی گئی ہیں تو ان کا تجزیہ کر ڈالیے گا۔ انہیں میری روح پر نہ تھوپیے گا۔[1] "خاکسار عصمت"

---

[1] آپ کی باتیں ہرگز ناگوار نہیں گزریں۔ آپ نے جذبات میں سب کچھ لکھا ہے اور جذبات تو انسان کا امتیاز نہیں۔ ان کے تحت کوئی جو مرضی لکھ ڈالے غصہ ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ (راشد)

سستی اور معیاری کتابیں

افسانے

ان داتا	کرشن چندر
تین غنڈے	کرشن چندر
پانی کا درخت	کرشن چندر
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر
طلسم خیال	کرشن چندر
پرانے خدا	کرشن چندر
جشن حماقت	کرشن چندر
سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو
لذت سنگ	سعادت حسن منٹو
نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو
توبہ توبہ	واجدہ تبسم
اپنے دکھ مجھے دے دو	بیدی
لمبی لڑکی	بیدی
گرہن	بیدی
لاجونتی	بیدی
دانہ و دام	بیدی
مکتی بودھ	بیدی
کوکھ جلی	بیدی
سرکش روحیں	خلیل جبران
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور
ایک بات	عصمت چغتائی
چند تصویر بتاں	عصمت چغتائی

ناول

دوسری برف باری سے پہلے	کرشن چندر
ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر
ایک چادر میلی سی	بیدی
معصومہ	عصمت چغتائی
سودائی	عصمت چغتائی
غدار	کرشن چندر

ڈرامے

شکنتلا	کالی داس

خطوط

زیر لب	صفیہ اختر
حرف آشنا	صفیہ اختر

نفسیات

میٹھے بول میں جادو ہے	ڈیل کارنیگی
پریشان ہونا چھوڑیئے	ڈیل کارنیگی

تاریخ

کمپنی کی حکومت	باری

شاعری

دیوان ساغر	ساغر صدیقی

نیا ادارہ

۱۵۔ سرکلر روڈ، لاہور